MAY
2021

جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

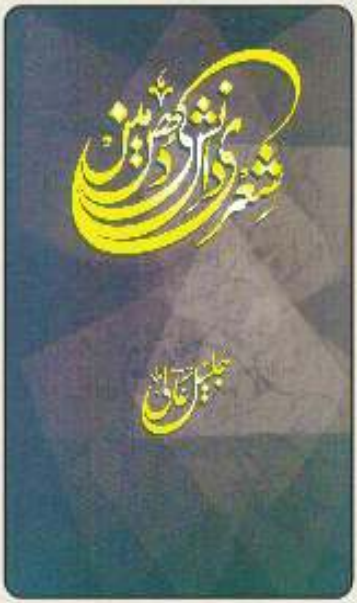

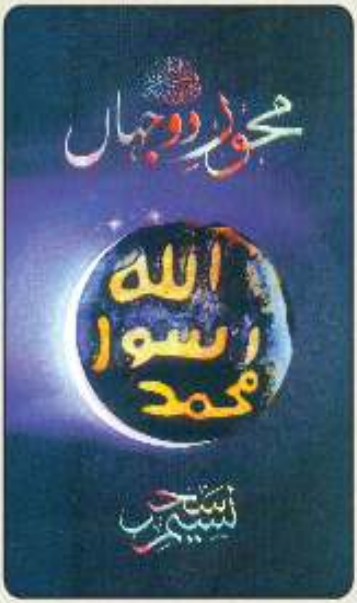

محبوبِ دو جہاں
اللہ
رسول
محمد
نسیم سحر

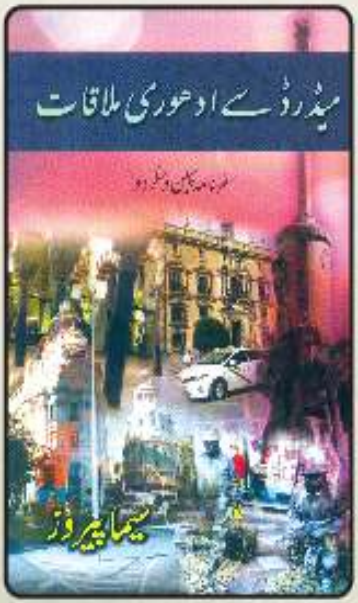

سیما پیروز

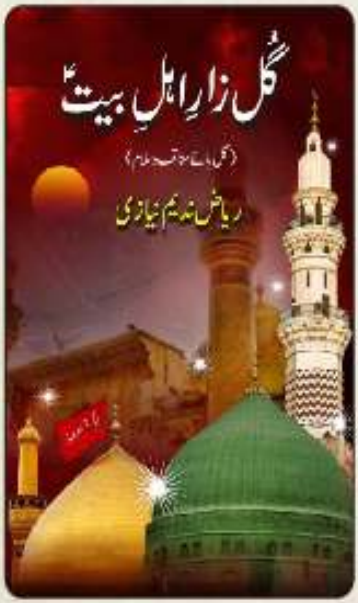

گلزارِ اہلِ بیتؑ
ریاض ندیم نیازی

غزل

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

وہ جسم سے روح میں اُتر کر
آہٹ کی طرح بکھر گیا تھا

وہ حشر بدوش کوے جاں سے
کیسا چپ چپ گزر گیا تھا

اب تک نگراں ہے ذرّہ ذرّہ
وہ خاک بسر جدھر گیا تھا

ہر شخص تھا نوحہ گر کسی کا
جیتے جی کون مر گیا تھا

اک گھر سے اُٹھا ہُوا بگولا
بستی بستی بکھر گیا تھا

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شارح

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - مئی 2021 - شمارہ نمبر: 5

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: نجیب احمد اور شفیق سلیمی

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز، 16 کلومیٹر، سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، خاور اعجاز، سید ضیا حسین، رضا اللہ حیدر	7 تا 10
2	نعت	آصف ثاقب، جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، راحت سرحدی محمد انیس انصاری، عقیل رحمانی، اقبال سروبہ، اکرم ناصر، احمد جلیل سرور حسین نقشبندی، شہزاد احمد شیخ، صغیر احمد صغیر، احمد سجاد بابر	11 تا 23
3	عقیدت	عقیل رحمانی	24
4	قطعات	خاور اعجاز	25
5	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	26 تا 30
6	رفتگاں	سید ریاض حسین زیدی، حامد یزدانی، اسلام عظمی ممتاز راشد لاہوری، نذر عابد	31 تا 54
7	افسانے	بلقیس ریاض، پیروز بخت قاضی، کلیم خارجی، جمیل احمد عدیل انعام الحسن کاشمیری، احمد اسد اللہ، سلمان یوسف سمیجہ	55 تا 92
8	مائیکرو فکشن	سید تحسین گیلانی	93
9	ترجمہ	فرحت پروین	94 تا 98

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جمیل یوسف، جلیل عالی حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، انعام الحق جاوید خاور اعجاز، گلزار بخاری، راحت سرحدی، منظور ثاقب، حمیرا راحت سید قاسم جلال، رشید آفرین، شاہنواز زیدی، ممتاز راشد لاہوری یعقوب پرواز، حامد یزدانی، واجد امیر، شبہ طراز، احمد جلیل رخشندہ نوید، اعجاز روشن، ریاض روہانی، افتخار شاہد، نیلم احمد بشیر رخسانہ سمن، اقبال سروبہ، طاہر ناصر علی، محمد نوید مرزا عزیز عادل، علی حسین عابدی، حسنین سحر، اشفاق ناصر، انصر حسن وسیم عباس، طالب انصاری، شہزاد احمد شیخ، ذکی طارق، اکرم ناصر زبیر فاروق، امر مہکی، امجد بابر، ماجد یزدانی، ارشد محمود ارشد آفتاب خان، اسد الحوان، عنبرین خان، اکرم جاذب، نبیل قیصر صغیر احمد صغیر، حکیم خان حکیم، عمر قیاز قائل، بشیر احمد حبیب عاصم اعجاز، فرح شاہد، علی آرش، محمد علی ایاز، احمد محسود ازور شیرازی، محسن رضا شانی، تاثیر جعفری، احسان علی حیدر اسامہ منیر، سید فرخ رضا ترمذی، طارق جاوید، خالق آرزو امتیاز انجم، رضی رضوی، نائیلہ راٹھور، راجا شاہد امیر	99 تا 167
11	آبیتی	شوکت علی شاہ	168 تا 177
12	مضامین	اختر شمار، محمد حنیف، جمشید مسرور، اقبال خان یوسف زئی سیدہ آیت گیلانی، شاہدہ دلاور شاہ، علی حسین عابدی	178 تا 209
13	طنز و مزاح	سیدہ آمنہ ریاض، نور کمال شاہ	210 تا 216
14	نظمیں	امجد اسلام امجد، نسیم سحر، گلزار بخاری، کرامت بخاری، خاور اعجاز منظور ثاقب، طلعت شبیر، کبیر اطہر، اقبال سروبہ، امین کنجاہی امجد بابر، سرور حسین نقشبندی، ارشد محمود ارشد، نائیلہ راٹھور، صغیٰ خان	217 تا 233
15	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، ہارون الرشید، طالب انصاری آفتاب احمد ملک، انعام الحسن کاشمیری، رانا محمد شاہد، راحت سرحدی، حامد یزدانی	234 تا 241

حمد

جسے بقا ہے ازل سے وہ ذات اس کی ہے
فنا ہے سب کو تو شانِ ثبات اس کی ہے

حدودِ کون و مکاں، لامکاں ہیں سب اس کے
کہ ماورائے تخیل بھی ذات اس کی ہے

ہمیں یہ زندگی اس کی عطا ہے کیا کہنا!
وہ خود حیات ہے اور یہ حیات اس کی ہے

نکل کے کوئی کہاں جائے گا بھلا سوچو!
کہ حکمرانی یہاں شش جہات اس کی ہے

وہی ہے مالکِ قدر و قضا وہی معبود
ہزار راتوں سے افضل بھی رات اس کی ہے

ہمیں تو اس نے یہاں امتحان میں ڈالا
کہ پیدا کردہ حیات و ممات اس کی ہے

یہ صبح و شام کی گردش بھی معجزہ ہے حسنؔ
فضائے عشق پسِ کائنات اس کی ہے

حسن عسکری کاظمی

حمد

گذرتی جا رہی ہے آج تک جس کے سہارے پر
متاعِ زندگی قربان اُس کے اِک اشارے پر

اُسے معلوم ہے میری ضرورت بھی، طبیعت بھی
مجھے بہنا نہیں آیا کبھی دُنیا کے دھارے پر

مِٹا دیتا ہے جو نام و نشاں تک بھی سفینوں کے
وہی لاتا ہے میری ڈوبتی کشتی کنارے پر

مَیں اُس کی رائے کا ہی منتظر ہُوں کارِ ہستی میں
سو مَیں نے چھوڑ دی ہے بات ساری استخارے پر

اُسے اُمید ہے شاید کہ پھر خورشید بن جائے
نظر رہتی ہے اُس کی عرش سے ٹوٹے ستارے پر

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو ہی حافظ ہے میرے بچوں کا
میرے شہروں کا میرے قصبوں کا

حمد

میرے دل میں جو بس گیا، تُو ہے
مجھ کو چاروں طرف مِلا تُو ہے

تُو ہے واحد، اَحد، صمد، اللہ
میرا معبود، اے خدا! تُو ہے

تُو ہی ہے، لم یلد و لم یو لد
جو ہے یکتا ، وہ برملا تُو ہے

بطنِ مادر میں اِک الگ صورت
سب کو کرتا ہے جو عطا ، تُو ہے

تیری آنکھیں نہ کان ہیں ، لیکن
پھر بھی سنتا ہے دیکھتا تُو ہے

ہے ہر اِک شے جہان کی فانی
جِس کو حاصل ہے یاں بقا، تُو ہے

تُو ہی سب سے جمیل ہے مولا
جس کی کرتے ہیں سب ثنا، تُو ہے

کوئی سنتا نہیں یہاں جس کی
ایسے بے بس کا آسرا تُو ہے

کیسے ظلمت میں اب ضیاؔء بھٹکے
اِسکے دل میں ہے جو ضیا، تُو ہے

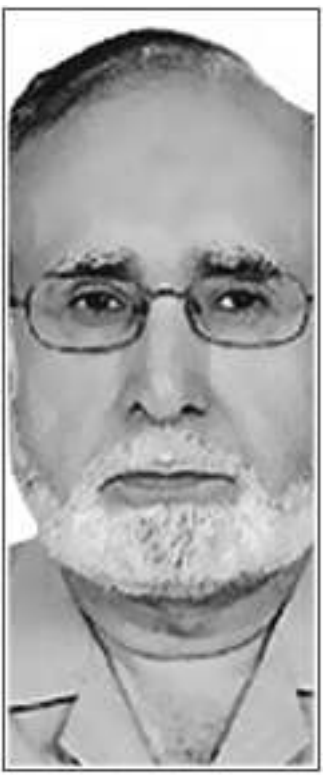

سید ضیا حسین

حمد

رضا اللہ حیدر

طائرِ فکر کی پرواز ترے نام سے ہے
میرے ہر کام کا آغاز ترے نام سے ہے

شاخِ عقبیٰ بھی ثمر بار ترے فضل سے ہے
نخلِ دنیا ہے جو ممتاز ترے نام سے ہے

زندگانی کے بھنور ورنہ نگل ہی جاتے
یہ سفر اور یہ تگ و تاز ترے نام سے ہے

تیری رحمت ہی سے مہکے ہیں ثنا کے گلشن
اس چمن میں مری آواز ترے نام سے ہے

ڈھانپ لیں گی تری بخشش کی گھٹائیں ہم کو
ہم فقیروں کا سبھی ناز ترے نام سے ہے

خالقِ اعظم و اکبر! یہ رضاؔ تیرا گدا
اس کا آہنگ یہ انداز ترے نام سے ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تختِ مرمر پہ کل تھے آسودہ
مرمر آسودگان زیرِ مزار

نعتؐ

مری بستی کے ثاقب سب مدینے جانے والے ہیں
نجانے ہم مسافر کب مدینے جانے والے ہیں

محبت کی لگن بے حال کر دیتی ہے جب اِن کو
مرے غمگیں سخن ہر شب مدینے جانے والے ہیں

سبق سب پڑھ لیا خدمت، اطاعت اور ملّت کا
یہ طالب چھوڑ کر مکتب مدینے جانے والے ہیں

صدائیں خیر کی گونجی ہیں اس بستی کے لوگوں میں
نظر آتا ہے سب کے سب مدینے جانے والے ہیں

کبھی لوگوں سے ہم بھی کہہ سکیں صدقے محمدؐ کے
نہیں گھر سے ہمیں مطلب مدینے جانے والے ہیں

حوالے کر دیا رب کے، گھروں کو جانے والوں نے
انھیں کیا فکر ہو وہ جب مدینے جانے والے ہیں

ہمیشہ کے لیے سیراب ہو جائیں گے دیوانے
محمدؐ کے وہ تشنہ لب مدینے جانے والے ہیں

آصف ثاقب

نعتؐ

دل کو حق آشنا کیا کفر سے دُور لے گیا
ہم کو کرم کریم کا پیش حضورؐ لے گیا

بھر لی لہو میں روشنی پا گیا رازِ زندگی
جو بھی درِ رسول سے نقدِ شعور لے گیا

زیرِ پناہ مستقل ہو نہ سکا کبھی خجل
سیرتِ پاک سے جو دل خلق کا نور لے گیا

یہ ہیں کچھ اور سلسلے عقل کو کیا پتہ چلے
دل جو درِ حبیبؐ سے کیف و سرور لے گیا

میں کہ انا کا صید تھا دامِ ہوس میں قید تھا
موجۂ عشقِ مصطفیٰ سارے فتور لے گیا

حد سے فزوں ہوا ہراس دل کو مگر تھی ایک آس
کاسۂ چشم اسؐ کے پاس شرم سے چور لے گیا

پایا جو اذنِ حاضری عالیِ خامکار بھی
حسرتِ مدح میں لکھی اپنی سطور لے گیا

جلیل عالی

نعت

نبیؐ کے ذکر سے ناشاد دل کو شاد کرتے ہیں
کسی سے کب فقیرانِ حرم فریاد کرتے ہیں

ریاضِ نعت میں یہ پھول ہیں ان کی عنایت سے
ثنا کے ہم کہاں تازہ سخن ایجاد کرتے ہیں

کہاں جلوت کی ویرانی کوئی ان کو ڈرائے گی
جو خلوت اپنی اُن کے ذکر سے آباد کرتے ہیں

تشکر سے خوشا اس آن پلکیں بھیگ جاتی ہیں
مدینے حاضری کی جب بیاں روداد کرتے ہیں

بکھر جاتے ہیں لاتعداد موتی علم و حکمت کے
رسولؐ دوسرا جس آن بھی ارشاد کرتے ہیں

دیارِ قلب و جاں میں جب گھٹن محسوس ہوتی ہے
تو یادِ رحمتِؐ عالم سے استمداد کرتے ہیں

انہی کے دم سے ہیں ضوباریاں روئے عقیدت کی
نبیؐ کے ہر اشارے پر قمرؔ جو صاد کرتے ہیں

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

کریں گے جب نظر سرکار میرے
تو ہو جائیں گے بیڑے پار میرے

درودِ پاک پڑھتی ہیں ہوائیں
مہکتے ہیں در و دیوار میرے

یہ شاخوں پر ثنا گستر پرندے
دعائیں مانگتے اشجار میرے

اگر ان کا کرم ہوتا نہ مجھ پر
تو ملنے تھے کہاں آثار میرے

ہیں ان کے نام کی برکت سے اب تک
منور گنبد و مینار میرے

کرشمے دیکھ ذکرِ مصطفےٰ کے
کبھی رکتے نہیں ہیں کار میرے

عطا اُن کی نہ شامل ہو جو راحتؔ
تو میں کیا اور کیا اشعار میرے

راحت سرحدی

نعتؐ

کٹ جائے گی جیون کی سیہ رات کسی دن
ہو جائے گی آقاؐ سے ملاقات کسی دن

آئے گا مدینے سے ہوا کا کوئی جھونکا
مہکیں گے مرے فن کے مضافات کسی دن

کاسہ لیے بیٹھے ہیں مدینے کے گداگر
بانٹیں گے فقیروں میں وہ خیرات کسی دن

آنکھوں میں سما جائے گا وہ چہرۂ انور
بن جائے گی ہم ایسوں کی بھی بات کسی دن

روئیں گے کبھی سینۂ اقدس سے لپٹ کر
برسے گی عجب ڈھنگ سے برسات کسی دن

آقاؐ کی محبت مری مٹی میں رچی ہے
خورشید بنیں گے مرے ذرّات کسی دن

گردش میں ہو پھر دودھ کا پیالہ سرِ مجلس
لوٹ آئے وہی دورِ عنایات کسی دن

پائیں گے انیسؔ دل و جاناں کو مقابل
اُٹھ جائیں گے آنکھوں سے حجابات کسی دن

محمد انیس انصاری

نعتؐ

آسماں راہ گزر ہے اُنؐ کی
کہکشاں گردِ سفر ہے اُنؐ کی

علیؓ اور ابنِ علیؓ ، نورِ نظر
فاطمہؓ لختِ جگر ہے اُنؐ کی

جن کو حاصل ہے سہارا اُنؐ کا
رات اُنکی ہے سحر ہے اُنؐ کی

دو جہاں آپ کی چھاؤں میں رہیں
ذات سرسبز شجر ہے اُنؐ کی

معجزہ شقِ قمر ہے انکا
پلٹے سورج جو ، نظر ہے اُنؐ کی

یہ فلک زیرِ نگیں ہے انکے
اور زمیں زیرِ اثر ہے اُنؐ کی

نُور ہی نُور سراپا انکا
ہستی معراجِ بشر ہے اُنؐ کی

تتلیاں ، پھول ، شجر ہیں انکے
اور ہر شاخِ ثمر ہے انکی

قاسمِ رزق زمانے کے وہی
گرچہ فاقوں میں بسر ہے اُنؐ کی

نور سے اُنؐ کے زمانے روشن
اک جھلک شمس و قمر ہے انکی

تخت والے تیرے قدموں پہ نثار
تاجِ شاہی بنے ٹھوکر انکی

جن کو دیدارِ محمدؐ ہو نصیب
موت ، جنت کا سفر ہے انکی

دو جہاں آپؐ کی مٹھی میں عقیلؔ
اور ہر شے پہ نظر ہے اُن کی

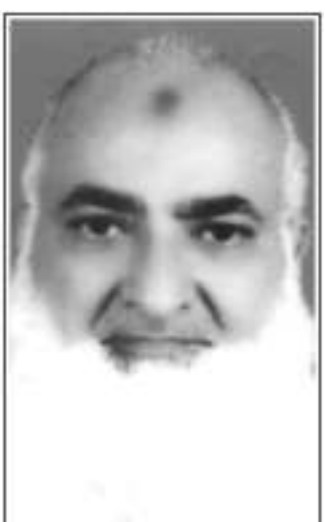

عقیل رحمانی

نعتؐ

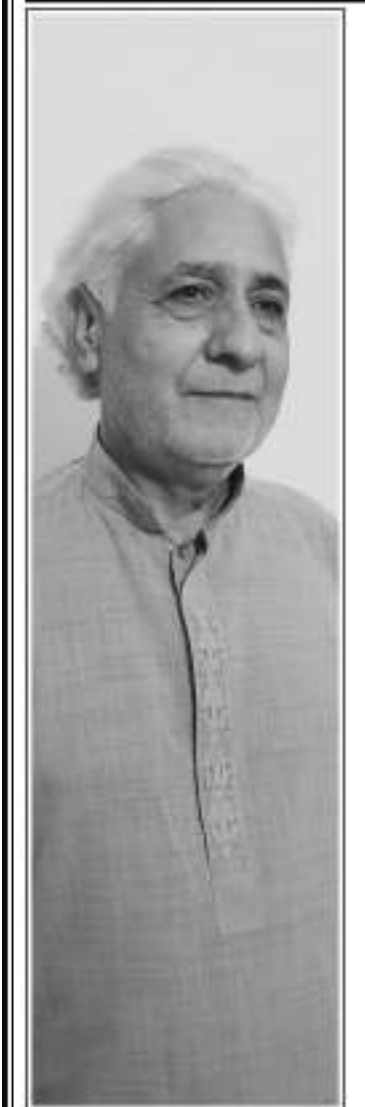

خدائے لم یزل کی ذات کا عرفاں محمدؐ ہیں
شہِ پیغمبراں ہیں مظہرِ یزداں محمدؐ ہیں

جھکے ہیں جس کی ذاتِ پاک کے آگے فرشتے بھی
وہی انسان کامل ہیں وہی ذیشاں محمدؐ ہیں

انہیں پہچان کر انساں نے پہچانا ہے خالق کو
جمالِ کبریا آئینۂ ایماں محمدؐ ہیں

"نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر"
کہ تخلیقِ دو عالم کا جلی عنواں محمدؐ ہیں

بشارت دی تھی اپنے دور میں یہ ابنِ مریم نے
دکھی انسانیت اور درد کے درماں محمدؐ ہیں

ہمارے سر پہ ان کا آج بھی ہے سایۂ رحمت
شہنشاہِ دو عالم وقت کے سلطاں محمدؐ ہیں

کریں گے وہ شفاعت اپنی اے اقبالؔ محشر میں
گنہگاروں کی بخشش کا فقط ساماں محمدؐ ہیں

اقبال سروبہ

نعتؐ

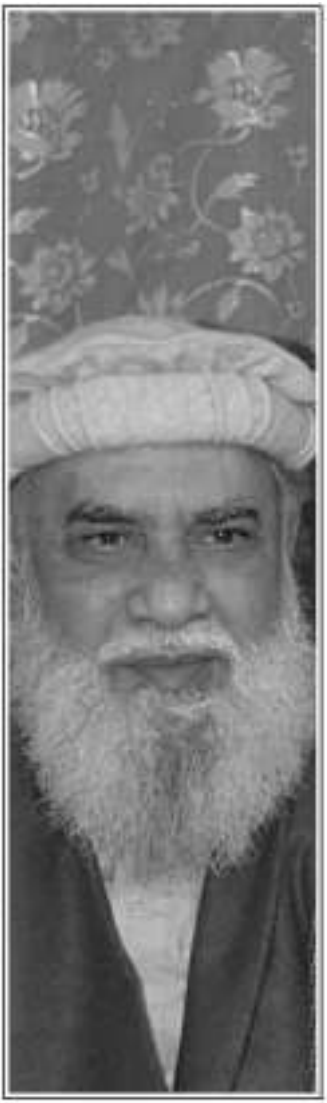

ندامتوں کے پسینے سے ہوں نہایا ہوا
میں آ گیا ہوں، کہ مجرم ہوں، اور بلایا ہوا

ہو جرم جب کوئی سرزد، یہیں پہ آتا ہوں
پھر آ گیا ہوں، کہ یہ در ہے آزمایا ہوا

کرم کی بھیک پہ امید کے چراغوں کا
کبھی بجھایا ہوا ہے، کبھی جلایا ہوا

حضور، آپ کی امت کا اک نمائندہ
حضور، سارے زمانے کا ہے ستایا ہوا

طبیب شہر مدینہ کے پاس لایا ہوں
مریضِ عشق، کہ پہلے بھی ہے دکھایا ہوا

نجانے کون ہیں جن کو نظر نہیں آتا
مرے تو سر پہ سدا آپ ہی کا سایہ ہوا

حضور! آپ سنیں گے ناں میرا قصۂ غم
ابھی تلک تو کسی کو نہیں سنایا ہوا

صدائے لا الہ آتی ہے میرے اندر سے
حضور میں نے ہے خوابیدہ دل جگایا ہوا

اکرم ناصر

نعت

ہر طرف صلِ علیٰ کی روشنی
کوبکو خیرالوریٰ کی روشنی

چارسو ہیں اُنؐ کے جلوؤں کے ہجوم
ہر طرف ہے انتہا کی روشنی

مصطفیٰؐ کی شکل میں ظاہر ہوئی
ہر طرف ربِّ علا کی روشنی

جگمگائے راستے اور منزلیں
دیکھ کر نورالھدیٰ کی روشنی

کس طرح ناآشنائی اوڑھ لوں
ہر طرف ہے آشنا کی روشنی

ریت کے ذرّے دھلیں جب خون سے
پھوٹتی ہے کربلا کی روشنی

جو خلیلؑ اللہ نے مانگی جلیلؔ
ہیں محمدؐ اُس دعا کی روشنی

احمد جلیل

نعتؐ

ہم پہ چشمِ کرم کیجئے
منتشر ہیں بہم کیجئے

اپنی آنکھوں کا کر کے وضو
اُنؐ کی مدحت رقم کیجئے

زندگانی سنور جائے گی
آرزوئے حرم کیجئے

سر کو رکھنا اگر ہے بلند
اُنؐ کی چوکھٹ پہ خم کیجئے

صبحدم پڑھ کے اُنؐ پر درود
اپنی آنکھوں پہ دم کیجئے

نعت کا جب ہو دل پر نزول
گفتگو کم سے کم کیجئے

مرکز و محور زندگی
اُنؐ کا نقشِ قدم کیجئے

کھولئے اُنؐ کی سیرت کے باب
سیرِ لوح و قلم کیجئے

نعت کہنے کا گر ہو خیال
پہلے آنکھوں کو نم کیجئے

ہو زباں کا وظیفہ درود
بس یہی دم بہ دم کیجئے

اُنؐ کے احکام کو تج دیا
خود پہ یوں مت ستم کیجئے

پیروی کر کے سرکارؐ کی
بندگی محترم کیجئے

جتنی سرورؔ ملے زندگی
مدحِ شاہِ اُممؐ کیجئے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دیکھیے ہر سمت ذکرِ مصطفےٰ کی وسعتیں
چارسُو پھیلی ہوئی حمد و ثنا کی وسعتیں

ہیں منوّر آپ ہی کے نور سے عرب و عجم
اور روشن ہیں سبھی ارض و سما کی وسعتیں

حالِ دل سب جانتے ہیں ہر سوالی کا حضورؐ
سب نے دیکھی آپؐ کے جود و سخا کی وسعتیں

مانگنے والے بھلا اُس در سے خالی کیوں اُٹھیں
جانتے ہیں یہ کرم کی اور عطا کی وسعتیں

خون میں شامل ہے میرے آتشِ عشقِ نبیؐ
کیا ڈرائیں گی مجھے دشت و بلا کی وسعتیں

کیا ہوا شہزادؔ مجھ سے ہے مدینہ دور آج
لے ہی جائیں گی وہاں میری دعا کی وسعتیں

شہزاد احمد شیخ

نعتؐ

نبیؐ کا ذکر بھی سن کر جو آبدیدہ نہیں
مری نظر میں تو وہ شخص برگزیدہ نہیں

گناہ گار ہو، ہو بھی کوئی مرے جیسے
مرے نبیؐ کا کرم ہے سزا رسیدہ نہیں

مدینے والوں سے پوچھو تو سب یہ کہتے ہیں:
بہت کرم ہے یہاں کوئی غم گزیدہ نہیں

مجھے بلال کے مسلک پہ رشک آتا ہے
غلام ہونے سے افضل کوئی عقیدہ نہیں

نظر جھکا کے ادب سے اسے پڑھا کیجے
صغیر ، نعت ہے یہ عام سا قصیدہ نہیں

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کا عشق سما دے رگ رگ کس کا فضل عمیم
سینہ سینہ روشن رکھے ایک تپاں مہکار

نعتؐ

زمین زادوں کی خاطر اصول لازم تھا
خدا کے بعد یقیناً رسول لازم تھا

وہ اک ستارہ ازل سے چمک رہا تھا جو
غبارِ شب میں اُسی کا نزول لازم تھا

خزاں کا دور تھا چاروں طرف کہ آپ آئے
کہ نکہتوں کے لئے ایسا پھول لازم تھا

حسین بیٹھے جو دوشِ نبی پہ سجدے میں
کیا طویل یہ سجدہ کہ طول لازم تھا

بھٹک رہا تھا زمانہ اِدھر اُدھر کب سے
مرے رسولؐ یوں تیرا حصول لازم تھا

اندھیری رات میں سورج نکل پڑا بابرؔ
وجودِ حق تھا ، سبھی پر قبول لازم تھا

احمد سجاد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

عقیدت

کربلائے وادئ طائف میں جو چمکا چراغ
زیرِ خنجر کر گیا وہ دائمی سجدہ چراغ

شہنشاہِ انبیاء ہیں، آپؐ ہیں ختم الرسل
نورِ حق سے جو منور، آپؐ ہیں ایسا چراغ

دیکھو اہلِ بیت کا ہر ہر نفس ہے روشنی
جب کماں سے تیر نکلا، بن گیا بچہ چراغ

معجزہ ہے جب بھی پڑھتے ہیں درودِ پاک ہم
روشنی دیتا ہے دل کے طاق میں رکھا چراغ

آپؐ نے دیکھا تو ہر پتھر سے پھوٹی روشنی
آپؐ نے چاہا تو بننے لگ گیا ذرہ چراغ

دو جہانوں میں اُجالے بانٹتی ہے جس کی لو
تاابد ہیں دینِ حق کا آپؐ وہ زندہ چراغ

مومنو غارِ حرا سے جب ہوائے حق چلی
بجھ گیا اک آن میں ہی کفر کا سہما چراغ

آپ آئے تو بجھے فارس کے سب آتشکدے
محل کے کنگرے گرے اور کفر کا ٹوٹا چراغ

اک نظر ہی آپ کی روشن دل و جاں کر گئی
ورنہ میرا جسم تھا مٹی کا اک بجھتا چراغ

سر جھکا کر شاخ نے نامِ محمدؐ جب لیا
رب نے بخشا اسکو تازہ پھول کا مہکا چراغ

زندگی روشن ہوئی کلمے کی برکت سے عقیلؔ
لا الٰہ کے ساتھ ہے نورِ محمدؐ کا چراغ

عقیل رحمانی

قطعات

اِتنا مصروف زندگی کا سفر
آخری وقت میں فضول گیا
سَر پہ اُفتاد وہ پڑی آ کر
سانس لینا بھی مجھ کو بھول گیا

ہلکا ہلکا سا ابر چھایا ہے
مگجا چاندنی کا سایا ہے
دُور ، تنہا درخت کے نیچے
کرب سے کوئی کسمسایا ہے

دُوسروں کی خوشی مقدم ہے
اپنی محرومیوں کا غم نہ کرو
زِندگی کو سنوارنا ہے تو پھر
زخم کھا کر بھی مسکراتے رہو

تیری دُنیا میں رہنے والوں کی
زندگی پائمال ہے یارب
اَور کوئی سزا مِلے لیکن
قیدِ ہتی محال ہے یارب

آؤ تجدیدِ التفات کریں
جاوداں لمحۂ حیات کریں
چاند مدھم ہے ، چاندنی چپ ہے
رات جاتی ہے کوئی بات کریں

شبنمی رُت ہے اَور آنکھوں میں
دھیمے دھیمے چراغ روشن ہیں
گویا اِک چاند جیسے چہرے پر
کچھ ستاروں کے داغ روشن ہیں

زِندگی میں نصیب چین کہاں
زِندگی عالمِ حوادث ہے
کارزارِ حیات میں خاورؔ
اِک اجل ہی سکوں کی باعث ہے

خاور اعجاز

حاصل اور محرومی

جو اللہ کرے اس پر راضی رہنے کا نام اطمینان ہے زندگی تو ہے ہی ایسی کہ حاصل نے بھی پریشان کیا اور محرومی نے بھی آسائشوں نے بھی پریشان کیا اور نارسائی نے بھی مسند نے بھی پریشان کیا اور بے توقیری نے بھی بائیسویں سکیل نے بھی پریشان کیا ور درجہ چہارم کی نائب قاصدی نے بھی اے۔ سی کی ٹھنڈی ہوا نے بھی پریشان کیا اور جون کی تپتی دوپہر کی لو نے بھی میٹھی نیند والے خراٹے بھی پریشان کن تھے کراور رت جگے بھی یہاں سلیبرٹی بھی پریشان تھے اور راہ چلتے عام لوگ بھی جس شخص کو راہ چلتے ہوئے کوئی دوسری بار مڑ کر دیکھنے کا بھی تکلف نہیں کرتا وہ بھی پریشان ہے اور وزیر اعظم بھی ریڑھی والا بھی نالاں تھا اور صدر مملکت بھی۔۔

وجہ یہ ہے کہ اگر زندگی کو یہاں ٹھہرنے کی خواہش ہے تو پھر دکھ ہی دکھ ہوگا۔ اس لیے کیوں نہ ایسا کریں کہ میں اور آپ جس حالت میں رخصت ہونا چاہتے ہیں وہ ابھی سے اختیار کر لیں اور جو کچھ حاصل ہے اس پر مطمئن ہو جائیں زندگی کی خوشیوں کی کنجی یہی سوچ ہے اور جسے یہ کنجی مل گئی اس کی موج ہی موج ہے ورنہ دکھوں کی فوج ہی فوج ہے جو ہر وقت میرے اور آپ کے درپے آزار رہتی ہے اور رہے گی اور یہ جو میں نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا یہی اصل ہے کہ جس حالت میں میں مرنا چاہتا ہوں اس حالت میں زندگی گزارنا شروع کر دوں پھر میری موت نہ تو اچانک ہوگی اور نہ ہی یہاں سے جاتے ہوئے مجھے حسرت ہوگی۔ مجھے اس چیز کی ریہرسل کرنا ہوگی کہ ہر روز صبح نہ سہی تو ہفتے عشرے میں ایک بار صبح صبح خود پوچھوں

''کیا ابھی بلاوا آجائے تو یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جانے کے لیے تیار ہو،،

اگر ہمارا جواب اثبات میں ہو تو یہ حد درجہ اطمینان والی بات ہے اگر جواب نفی میں ہے تو پھر سوچ کی لوچ کردار کے پتوار اعمال اور اموال پر نظر ثانی کی ضرورت ہے

سلیمان عبداللہ ڈار

کہ ہادی برحق نے اپنی سب سے لاڈلی بیٹی کی تربیت بھی انہی خطوط پر کی کہ جب کچھ خدام بارگاہ رسالت میں آئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا حسنینؓ کی ماں گھر کے کام کاج کی وجہ سے کپڑے اکثر میلے رہتے ہیں ہاتھوں پر چکی پسنے سے گٹے پڑ گئے دن بھر کے کام کاج سے رات کو جسم تھکاوٹ سے چور ہو جاتا ہے (سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے یہ لوگ وجہ وجود کائنات تھے حضرت عمرؓ نے بھی عرض کیا تھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوبصورت بدن پر کھردری چٹائی کے نشان اور قیصرو کسریٰ جیسے آسائش کفار کے مزے لوٹیں دراصل اللہ کے سچے رسول نے معیشت آرام آسائش اور پیسے یا درہم و دینار والے شعبے کو کو درخور اعتنا سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی آپؐ کے گھر والوں نے) حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے فرمایا ابا جان سے کوئی خادم ہی مانگ لائیں آپ تشریف لے گئیں ۔ سردارؐ کائنات نے آتے ہوئے دیکھا تو محبت اور احترام سے اپنی چادر بچھائی اس پر بٹھایا آنے کا مدعا پوچھا پھر کچھ سوچ کر رحمتؐ دو عالم نے پیاری بیٹی سے کہا۔۔رات کو سبحان اللہ الحمد اللہ اللہ اکبر پڑھا کرو میری بیٹی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔

راقم نے اس پر بہت سوچا دراصل یہاں ایک باریک نقطہ ہے عظمت اور بلندی جس عظیم معمار پر رشک کرتی ہے وہ چاہتا ہے کہ میرے بچوں کے دل اور ان کا یقین مال سے پھر کر اعمال پر آ جائے ۔ ورنہ جہاں اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو خدام مل رہے تھے محبت بھری لاڈلی بیٹی کو تو ایک کیا ایک سے ایک بڑھیا غلام عطا کر دیتے مگر قربان جایئے حسن تربیت کے! سوچتا ہوں کوئی بڑے سے بڑا لیڈر بھی وہاں ہوتا (معاذ اللہ استغفر اللہ) تو ایسا نہ کرتا پھر ایسا کیوں ہوا ۔ وہ اس لیے کہ انبیاء ڈائریکٹ رب کی تربیت میں ہوا کرتے ہیں ۔ وہ حاصل پر مطمئن ہوتے ہیں انکے گھر کے ایک کونے میں جو مٹھی بھر جو ہوتے ہیں وہ انہی پر راضی رہتے ہیں۔

ہم اگر حاصل پر مطمئن ہو جائیں تو کیا ہوگا؟

* پھر ہمیں روزانہ کی ہوشربا دوڑ دھوپ بے فائدہ لگے گی۔
* پھر شکوہ گلہ اور مالک کی شکایت دل سے نکل جائے گی۔
* پھر ہم دوسروں پر تنقید سے اجتناب کریں گے۔
* اس دنیا کو بہر حال کسی نہ کسی روز چھوڑنا تو ہے ہی پھر اسے چھوڑنا یعنی مرنے سے پہلے مرنا آسان ہو جائے گا۔
* جسے معاف کرنا بہت ہی مشکل ہے اسے معاف کرنا آسان ہو جائے گا۔
* کہتے ہیں اللہ کو بخیل عابد سے سخی گناہگار زیادہ پسند ہے مال سے محبت کے باوجود پھر مال اللہ کی راہ خرچ کرنا آسان ہو گا۔

* ہمارے دن رات بہت مطمئن اور مسرور ہوں گے۔
* خواہشات کم ہو جائیں گی مسائل اور پریشانیاں کم ہو جائیں گی۔
* کرپشن کرنے اور حرام کمانے کو جی نہیں چاہے گا۔
* پھر مظلوم ہونا اک فیض لگے گا ظلم کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوگی۔
* ربوبیت کی زیادہ نہ سہی کچھ کچھ تو سمجھ آئے گی رب کی طرف توجہ ہونے کی داغ بیل پڑے گی۔
* پھر چپ رہنا بولنے سے کہیں زیادہ بہتر لگے گا۔
* رب کا قرب دریافت ہوگا۔
* اپنی ذات کی پہچان کا سفر شروع ہوگا اور یہ آغاز رب کی پہچان کی طرف لے جائے گا۔
* آپ اپنے دشمن کو گھر بیٹھے فتح کر سکیں گے۔
* یہاں ٹھہرنے کی خواہش ہر کسی میں ہے مگر آپ اس خواہش پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکیں گے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ پھر جاتے وقت حسرت اور افسوس نہیں ہوگا۔
* پھر طبیعت ایسی بن جائے گی کہ جو اللہ کرے آپ اس پر راضی رہنے کا فن سیکھ لیں گے۔
* پھر دل کا گھر آباد ہو جائے گا اور دنیا کا کانٹھ کباڑ اس میں سے نکل جائے گا۔ حالانکہ اس دنیا کا سب سے مشکل کام یہی ہے
* دل میں ایک ایسا شوق پیدا ہوگا جو وجد اور وجدان تک پہنچائے گا۔
* پھر ہم بیماری سے پریشان نہیں ہوں گے پھر علاج بھی اسی کے حوالے کر دیں گے جس کی طرف سے بیماری آئی تھی۔
* حاصل پر مطمئن ہو جانے والے اللہ کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔
* پھر روپیہ پیسہ آپ کا لازمہ یا زندگی کا مقصود نہیں رہے گا۔ پھر بینک بیلنس یا پے سکیل آپ کی پہچان نہیں بلکہ جذب و شوق آپ کی پراپرٹی کہلائے گا۔
* پھر غیر اللہ اور عین اللہ کی سمجھ آجائے گی۔
* پھر ہم ضمیر کی عدالت سے باعزت بری ہو جائیں گے ہم خود کو اپنے آپ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کر سکیں گے۔
* ایسا ہو سکے تو جب حاصل پر اطمینان اور لا حاصل کو رد کرنے کا حوصلہ مل سکے تو زندگی مطمئن مسرور اور بہت خوبصورت ہو جائے گی اس میں سے بے چینی افسردگی افراتفری اور دکھ درد دور ہو جائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آرزو ہی زندگی ہے آرزوئیں پالنے میں حرج بھی کوئی نہیں خواب دیکھنا ضروری ہے ظاہر ہے ہم ان خوابوں کا پیچھا کریں گے انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے کوشاں ہوں گے تو ہی ترقی کریں گے کسی اعلیٰ مسند پر بیٹھائے جانے کے

قابل ہونگے ایک بھرپور شاندار اور شان و شوکت سے پرزندگی گذارنے کے قابل ہو سکیں گے مگر اس آرزو کی خواہش اور اس خواب کو خود پر اس قدر اور اتنا حاوی نہ ہونے دیں کہ یہ خواہشات جان کا آزار ہی بن جائیں۔ منہ زور خواہشات زندگی میں بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ مطمئن مسرور بندے کو ہجوم میں تنہائیاں اور تنہائیوں میں ہجوم میسر آجاتے ہیں راقم کو یاد ہے کہ سالہا سال پہلے جب کالج کے زمانہ تھا ہمارے گاؤں کے ایک اللہ والے جب رب کریم کی محبت بھری باتیں کرتے تو مجھ سے پوچھتے

،، کبھی خلوت در انجمن والی کیفیت بھی حاصل ہوئی؟

مجھے ان دنوں اس بات کی سمجھ نہیں تھی (اب بھی نہیں) تو وہ کہتے کہ بعض اوقات اک ایسی کیفیت اللہ کی چاہت کرنے والوں کو میسر ہو جاتی ہے کہ وہ ہجوم میں ہوں تو بھی خلوت میں چلے جاتے ہیں۔ یعنی وہ رب کو یاد کر رہے ہیں اسکے حسین خیالوں کے جلووں میں گم ہیں۔

عجب انداز خود وار فتگی ہے
بھری محفل میں سب کے درمیاں گم

.....

بس وہ دل ہی دل میں اپنے سچے ساجن سے محبت کی باتیں کر رہے ہیں اردگرد کے شور وغل یا لوگوں کے لہولعب سے بے نیاز ہو کر وہ ہجوم میں بھی تخلیہ میں ہوتے ہیں اور تخلیہ تو پھر ظاہر ہے اک میں ہوواں اک توں ہوویں۔۔ (پنجابی میں اک میں رہوں یا میرا محبوب ہووالی کیفیت کو کہتے ہیں) والی عشق حقیقی کی اوج کمال کو پہنچی ہوئی لذت کی تعبیر ہے۔

عمل سے بڑی کوئی کسوٹی نہیں جس پر کسی کو پرکھا جا سکتا ہے حضرت اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بیٹے جناب جسٹس جاوید اقبال اپنی شہرہ آفاق تصنیف ،،زندہ رود،، میں یہی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جی کی ساری شاعری اور زندگی کا نچوڑ دیکھا تو اس کا ون لائنر یہی تھا۔

،، سوچ بہت بڑھیا ہو تو بھی عمل اس سے کہیں بہتر ہے،،

حاصل پر اطمینان ہمیں عمل پر اکساتا ہے یہی عمل پھر دل کی کھیتی میں محبت کا بیج بو کر اسے قربانی کا پانی دیتا ہے۔ پھر اسی زمین سے ایسے پاکیزہ پودے اگتے ہیں جن پر اخلاص کے پھل اور پھول لگتے ہیں۔ مگر اس سب کے پیچھے وہی حاصل پر قناعت اور محرومی سے بے نیازی ہی ہوتی ہے۔ اور جب یہ بے نیازی حاصل ہو جائے تو پھر بندہ اپنی خوشیوں کا جہاں دوسروں کے دکھوں پر تعمیر نہیں کرتا۔ پھر اسے حقیقی عشق کے جذبات اور حیرتوں کی دنیا دیکھنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ دنیا حقیقتوں سے دور سہی مگر اس دینا کے خوبصورت اور پر کیف ہونے میں انتہائی پر لطف ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اک بات تو بہر حال طے ہے کہ حاصل اور

محرومیاں مقدر میں لکھ دی گئی ہیں ہماری از حد احتیاط اور حد درجہ کوشش سے بھی انہیں بدلا نہیں جا سکتا مسئلہ جبر و قدر پر اسی سلسلے میں صدیوں سے بحث چلی آ رہی ہے ساری کی ساری قوتیں اور توانیاں صرف کر کے بھی محرومی کو حاصل کے قالب میں ڈھالنا عبث ہے ہاں دو صورتیں اس میں تبدیلی لا سکتی ہیں اک دعا اور دوسری صلہ رحمی ان دونوں صورتوں میں اللہ جل شان ہوا پنے طے شدہ فیصلے کو بدل دیتے ہیں اور وہ اس پر قادر ہیں مندرجہ بالا سطور میں میں نے اپنے جن بزرگوں کا ذکر کیا ان سے جب یہی سوال کیا تو وہ اک مخمور سی نظر سے دل ہی دل میں عرش کی طرف دیکھنے لگے پھر کپکپاتی ہوئی محبت بھری آواز میں مجھے کہنے لگے۔

،، ڈاکٹر صاحب ! رب سے کوئی پوچھنے والا نہیں وہ طے شدہ تقدیر کو بدل بھی تو سکتا ہے۔ یہ سچ کہ وہ مالک ہے جبار بھی ہے قہار بھی مگر وہ محبت کرنے والا سچا دوست بھی تو ہے۔،،

مگر بعض اوقات بظاہر کچھ لوگوں کے حالات اتنے پاکیزہ نہیں بھی ہوتے۔ گواہیاں اور شہادتیں ان کے حق میں نہیں بھی ہوتیں مگر رب انہیں نئی زندگی عطا کر دیتا ہے حاصل تو ان کے پاس ہوتا ہی ہے وہ انہیں لاحاصل بھی بغیر سعی کے عطا کر دیتا ہے ایسا کیوں؟

وہ فرمانے لگے۔

،، بس اسے کوئی ادا پسند آ سکتی ہے بے نیاز بادشاہ ہے دیالو مالک ہے قابلیت نہیں قبول نہیں کرتا قبولیت کام کر جاتی ہے اور پھر پیار کچہری کا وہ خود جج ہے ایسے جج کو گواہوں اور شہادتوں کی کیا ضرورت!

اس دنیا میں روز ازل سے لکھاری۔ شاعر۔ ادیب اور دانشور ازل سے ایک ہی کہانی لکھ رہے ہیں حاصل اور محرومی کی کہانی ! کبھی محبت حاصل ہو جاتی ہے کبھی بندہ محرمیوں کی اڈیالہ جیل کی کسی کال کوٹھری میں جا بیٹھتا ہے جہاں نہ روشنی نہ صاف پانی نہ آزادی نہ دوستوں کے قہقہے نہ گھر کا کھانا نہ آرام وہ بستر نہ اقتدار کی غلام گردشیں نا ہی چم چم کرتی مرسڈیز بینز گاڑیاں اور بھگیاں نہ ہی فلک شگاف نعرے نہ ہی بجتی ہوئی ائیریوں پر سجے سلیوٹ نہ ہی پانچ ستارہ سویٹ نہ ہی وال ٹو وال کارپٹ بس یہاں خستہ حال سیلن زدہ دیواروں والی کال کوٹھریاں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر ہی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو گھن آتی ہے پھر انہیں یہ سب دیکھ کر اک ہاں خیال تو آتا ہو گا کہ لاحاصل کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے حاصل بھی گنوا بیٹھے اور اب محرومیوں کا اک جہاں منہ کھولے انہیں دبوچنے کو تیار نظر آ رہا ہے خواہشات کے آگے اگر یہی لوگ قناعت کا بند باندھ لیتے تو محرومیوں کی پاتال میں گرنے سے بچ تو سکتے تھے۔

☆☆☆☆☆

کیا نجیب احمد بھی رحلت فرما گئے؟؟؟

میں جناب غلام نبی اعوان کے انتقال پر ملال پر اپنی بیٹی سیدہ آمنہ ریاض کو چند تعزیتی جملے لکھوا رہا تھا کہ اچانک اس نے محترم نجیب احمد کی وفات حسرت آیات کی خبر سنائی--- قطعاً یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے؟

لیکن قدرت الٰہی نے اپنے طور پر کچھ ایسے اہتمام کر رکھے ہیں کہ زندگی اور موت پر اس کی مکمل دسترس سے مفر نہیں۔ کیا پتہ وہ کس وقت کس کو اپنے پاس بلا لے؟

کاش وہ رہتے ہمارے درمیاں
کاش ان کو اور بھی ہم دیکھتے

.....

نجیب احمد ہر لحاظ سے اسم بامسمیٰ تھے۔ یعنی نجابت ان کے فکر و عمل کا عنوان جلی ہے۔ ادب میں، شاعری میں، محفل احباب میں، مشاعروں کی بزم آرائیوں میں، الحمرا کی ادبی بیٹھک میں، جناب احمد ندیم قاسمی کی رفاقتوں میں، خالد احمد کی لازوال دوستیوں میں ---الغرض ہر مقام پر انہوں نے اپنی نجابت کو سربلند رکھا۔

ان کا لب و لہجہ دھیما تھا۔ وہ کسی ناتراشیدہ جملے کو ادا کرنے کے کبھی گنہگار نہ ہوئے۔ مجھے ان کے ساتھ مختلف مشاعروں میں ان کی ہم نشینی کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے ان کے استادانہ مقام اور اونچے درجے کی ادبی منزلت کا ہر مقام پر مشاہدہ کیا۔ انہوں نے جناب احمد ندیم قاسمی سے بڑا فیض پایا۔ وہ ان کے ادبی پرچے فنون میں اپنے بلند ادبی قد کاٹھ کو ہر سطح پر منواتے رہے۔ ان کی تر و تازہ غزلیں بڑی معرکہ آرا ہوئیں۔ الفاظ کی سلاست لیکن معنی آفرینی سے مالا مال ان کا کلام بلاغت نظام ہر کسی سے شاباش پانے کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ رکھتا۔

جناب خالد احمد اور جناب نجیب احمد کی جوڑی ادبی دنیا میں مثالی سمجھی جاتی

سید ریاض حسین زیدی

سید ریاض حسین زیدی، علی اصغر عباس، باقی احمد پوری اور نجیب احمد۔

تھی - گویا وہ یک جان دو قالب تھے۔ فنون میں بھی خالد احمد اور نجیب احمد کو ہم رکاب پاتا۔ پھر انہوں نے بیاض کا اجرا کیا جو خالد احمد کی بہترین ادبی خوبیوں کا شاہکار تھا۔ یہاں بھی جناب نجیب احمد ان کے ساتھ تھے۔ ادارت کے اصحاب بلند مرتبت میں ان کا نام اول حیثیت کا حامل رہا۔ خالد احمد کی ہم دمی کا اعزاز انہوں نے ہر مقام پر برقرار رکھا۔ جب ان کی (خالد احمد) رحلت ہوئی تو مرحوم کی تعزیت میں ان کے حسرت ناک کلام نے بڑا مقام پایا۔ انہوں نے خالد احمد مرحوم کے بعد جناب عمران منظور کا بہترین ساتھ دیا۔ بیاض کے شعری حصے کی نوک پلک اور اس کی درستی سے وہ متواتر عہدہ برا ہوتے رہے۔

اپریل کے شمارے (لاہور نمبر) میں ان کا کلام نہایت معرکہ آرا ہے۔ جدید غزل کے خدوخال سنوارتے اور اسے جدید تر بنانے کے بیاض کے بیانیے کی انہوں نے آبیاری کی۔ انہوں نے بہت زیادہ لکھا۔ لیکن مجال ہے کہ ان پر کہیں بھی بھرتی کا الزام آئے۔ میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ عہد حاضر میں وہ خوبصورت غزل گو شعرا میں بڑے سربرآوردہ تھے۔ وہ استادانہ مقام کے حامل تھے کہ بیاض میں ارسال ہونے والے کلام میں کسی قسم کے سقم کو دور کرنے میں انہوں نے ہمیشہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ میں یہ چند سطور اپنی بیٹی سیدہ آمنہ ریاض کے ان کی خبر رحلت سنانے پر قلم برداشتہ لکھ رہا ہوں۔ ان کے کلام پر ڈھیروں مضامین لکھے جائیں گے۔ (کئی لوگوں نے ان پر ایم فل کر رکھا ہے)۔ لیکن بزم ادب میں وہ جس طرح اچانک انداز میں اٹھ کر چل بسے ہیں، وہ نہایت غم ناک ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

اے نجیب احمد! سلام الوداع
اے خدا! جنت میں ان کا گھر بسا

☆☆☆☆☆

آہ! غلام نبی اعوان ----- میرا چہیتا شاگرد

علامہ اقبال نے کہا تھا جو آمدنی ہے، وہ رفتنی ہے ----غلام نبی اعوان بھی رفتنی ہوگئے---اناللہ وانا الیہ رٰجعون ----

وہ ایک عرصہ سے علیل تھے-- لیکن علالت سے مرعوب ہو کر انہوں نے اپنے تحریری مشاغل سے کنارہ کشی اختیار نہ کی اور مختلف جہتوں میں وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری وساری رکھے ہوئے تھے- میں ان کی تحریری شگفتگی، تجربات کی رنگا رنگی اور مختلف مراحل زیست کی باکمال ترجمانی کے اوصاف کا شروع سے گرویدہ تھا-

وہ بالواسطہ میرے شاگرد بھی تھے- 1968-1969 میں جب میں رحیم یار خان میں بحیثیت لیکچرر متعین تھا، آپ تھرڈ ائیر کے طالب علم تھے- ان کی خطابت کی خاصی دھوم تھی اور وہ مختلف تقریری مقابلوں میں کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے نیک نامی کا باعث بنے-

اس عرصہ میں کالج کے پرنسپل سید فضل علی شاہ (مرحوم) نے فی الفور حکم جاری کیا کہ کالج میگزین پیام سحر کا بحر صورت مجلّہ ستمبر 1969 میں ضرور منصۂ شہود پر آنا چاہیے- مجھے اس کام کا سربراہ مقرر کر کے وہ مطمئن ہو گئے- چنانچہ میں نے انگریزی

سید ریاض حسین زیدی

کے مایہ ناز استاد پروفیسر سراج منیر اور پروفیسر نسیم احمد صدیقی کی معاونت سے اس کام کی انجام دہی کا بیڑہ اٹھایا۔ طلبہ میں تلاش کیا گیا کہ کون اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتا ہے؟ تو نہایت خوبرو، صحت مند اور کڑیل نوجوان غلام نبی اعوان نے تحریری مقابلہ میں اول پوزیشن حاصل کر کے ہمارے کام میں بھرپور معاونت کا اعلان کیا۔

میں آج پچاس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ اعتراف کرتا ہوں کہ غلام نبی اعوان نے اساتذہ سے بڑھ کر ان سے بہر صورت بہتر حالت میں اپنے فرائض انجام دیئے۔

پروفیسر عتیق خاوری (مرحوم)، پروفیسر سعید الرحمٰن (مرحوم) اور پروفیسر شبیر احمد مغل اس تحریری جہاد میں برابر کے شریک تھے۔

غلام نبی اعوان نے اس شمارے کا خود اداریہ لکھا، باکمال لکھا، مختلف مضامین کی نوک پلک درست کی اور ان کی کمی بیشی کا نہایت مہارت سے ازالہ کیا۔ یہ سب مواد نصف ماہ سے بھی کم عرصہ میں تیار ہو گیا اور جب اسے (مرحوم) فضل علی شاہ کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ وہ پرچہ فی الفور ربن پرنٹنگ پریس لاہور میں میری وساطت سے برائے طباعت ارسال کیا گیا۔ میں نے چار دن پرنٹنگ پریس میں ہی بسر کئے اور مواد کی پرنٹنگ کی نگرانی (اردو اور انگریزی دونوں حصوں کی) خود کی۔

الغرض یہ پرچہ وعدے کے عین مطابق اکتوبر 1968 میں چھپ کر آیا تو سب نے بالاتفاق اس کی نمایاں کامیابی میں غلام نبی اعوان کی زبردست خدمات کا اعتراف کیا۔

یہ تھا غلام نبی اعوان کا میرے ساتھ زبردست تعاون---- پھر وہ لاہور چلے گئے--اعلیٰ امتحانات سے کامیاب ہو کر بالآخر پاکستان آرمی میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہو گئے۔ اس عرصہ میں ان سے میرا تعلق بوجوہ منقطع رہا۔ میں رحیم یار خان سے ساہیوال چلا آیا۔ پھر بحیثیت پرنسپل عارفوالہ میں سات سال گزارے۔ غلام نبی اعوان نے مجھے تلاش کرنے میں خاصی تگ و دو کی، محکمہ تعلیم کے ذمہ داران سے میرا اتہ پتہ پوچھا۔ میرا کوئی مضمون روزنامہ جنگ میں چھپ گیا، جس پر میرا بحیثیت پرنسپل عارفوالہ پتہ درج تھا۔ پھر تو ان کے خوبصورت خطوط کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ وہ جہاں بھی گئے اپنی داستانیں چھوڑ آئے۔ ملتان میں فوجی افسر ہو کر بھی اردو

اکادمی کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے بلکہ نہایت نامساعد حالات میں اور سرکاری گرفت سے محفوظ کرنے میں انہوں نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی بڑی حفاظت کی۔

ان کا تصنیفی کارنامہ جھومتے لفظ چھپا تو اہل نظر نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ماہنامہ الحمرا میں کیا کیا یاد آیا کے عنوان سے اپنی سرگزشت حیات کی یاداشتیں خوبصورت ادبی پیرائے میں لکھیں۔

انہوں نے انشائیہ نگاری، مضمون نویسی اور خطوط نگاری کے حوالے سے اپنے ادبی کمالات کا لوہا منوایا۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ان کی متعدد کتابیں شائع کیں، جو بہترین ادبی حوالہ جات کے طور پر تسلیم کی گئیں۔

الغرض غلام نبی اعوان (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم خون کے آنسو رو رہا ہے) تحریری جہاد میں شمشیر برہنہ بن کر اپنا لوہا منواتے رہے۔ اس عرصہ میں وہ ایک بار ادب سرائے میں بھی آئے اور اپنی تحریروں اور خوبصورت خطابات سے نوازا۔

میں راولپنڈی گیا اور انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی تو وہ اپنے ضروری کام چھوڑ کر مجھے ملنے آئے اور مجھے میرے اہل خانہ سمیت واہ کینٹ تک چھوڑنے بھی گئے۔ اس سفر میں میری بیٹی سیدہ آمنہ ریاض بھی ہمراہ تھی۔

الغرض میں اپنی حیثیت میں ان کے اوصاف اور کمالات کا جائزہ لے سکا ہوں۔ زیادہ تر ان کے ادبی و علمی کارناموں کو اپنے وقت میں بھی سراہا گیا اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں ان کے خوبصورت حوالے درخشاں رہیں گے۔

ان کے صاحبزادے میجر کامران (خدا انہیں سلامت رکھے آمین) سے مرحوم کی تعزیت کرتے ہوئے میرے الفاظ اکھڑ اکھڑ گئے۔ ان کی وفات ادبی و علمی سانحہ ہے اور یقیناً ان کا خلا پر نہ ہو سکے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میجر کامران (بیٹا) ان کے غیر مطبوعہ کام کو چھپوانے کا ضرور اہتمام کریں۔ نہایت کارآمد تحریریں اشاعت کی منتظر ہیں۔

میں بیاض کے قارئین کی جانب سے (مرحوم) کی وفات پر اظہار تعزیت پیش کرتا ہوں۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

☆☆☆☆☆

روشنی خاک میں تحلیل نہیں ہوسکتی!

یادیں نجیب احمد کی

لہرالہرا کر چلتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کے ویسپا سکوٹر کا ہینڈل سنبھالے نجیب احمد ذرا سا ترچھا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پیچھے سوار تھا۔ سچی بات ہے ان کے بیٹھنے کا یہ انداز مجھے کچھ عجیب لگا۔ میں نے کہا:

''نجیب صاحب! کیا آپ نے نوٹ کیا ہے کہ آپ ٹیڑھا بیٹھے ہوئے ہیں؟''

انہوں نے گردن موڑی اور ہنستے ہوئے بولے: ''اسی لیے تو سکوٹر سیدھا چل رہا ہے۔ تم نے یہ نوٹ نہیں کیا ہوگا۔ ہے نا!''

منطق تو کچھ پلّے نہ پڑی پھر بھی یہ جواب سن کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے گردن پھر ذرا سی گھمائی اور مجھ سے سوال کیا:

''حامد یزدانی! یہ بتاؤ کہ تم جرمنی چھوڑ کر واپس لاہور کیوں چلے آئے؟''

ایک دو لمحے تو کچھ جواب سوجھا ہی نہیں مجھے۔ شہر کولون کی ہموار سڑکوں پر بہتی کاروں کے دھیمے دھیمے ردھم سے ایک بار پھر لاہوری ''کھڈوں'' کے پُرشور زیر و بم نے طبیعت ویسے ہی تل پٹ کر رکھی تھی۔ نسبت روڈ سے چلے ہوئے، مجھے لگتا تھا، جانے کتنا زمانہ بیت چکا اور ابھی ہم مزنگ

حامد یزدانی

نجیب احمد، حامد یزدانی، مرزا حامد بیگ اور محمد خالد۔

چونگی تک ہی پہنچے تھے۔ جوہر ٹاؤن کس عہد میں پہنچیں گے اس بات کا تعین ابھی قبل از وقت تھا۔ لاہور کے فراق میں جرمنی میں گذری راتیں تو خیر بسر ہوگئیں مگر ہجر کے دنوں کی طرح یہ سفر البتہ مجھے کتنا نظر نہ آتا تھا:

وہ رات تھی تو بسر ہو گئی کسی صورت
اگر یہ دن ہے تو کٹتا نظر نہیں آتا

.....

مجھے اس 'تعمیری' مہم پر روانہ کرنے کا سہرا خالد احمد کے سر تھا جنھوں نے لاہور میں گھر تعمیر کروانے کی میری خواہش کا سنتے ہی مجھے نجیب احمد کے سکوٹر کی عقبی نشست پر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ ''اس سلسلہ میں نجیب تمہاری مدد کرے گا''۔ انہوں نے کہا تھا۔ اور بس۔۔۔

اور اب نجیب احمد مجھے پلاٹ دکھانے جوہر ٹاؤن لے جا رہے تھے۔

''جواب نہیں دے رہے۔ کیا ہوا؟''۔ سر دھنا، گردیا شاید شور سے بچانے کے لیے سر اور کانوں کو رنگین مفلر میں لپیٹے نجیب احمد نے اچھرہ کی طرف جاتے فیروز پور روڈ پر باہم دگر الجھتی ٹریفک کے سیلاب کا حصہ بننے کے بعد مجھے پھر سے مخاطب کیا۔

''بس دل نہیں لگا وہاں۔ لاہور بہت یاد آتا تھا۔۔'' میں نے سڑک کے شور کو شکست دینے کی غرض سے حتی المقدور زور سے جواب دیا۔

''ہاہاہا۔۔ سمجھ گیا۔ سب لاہوریوں کا یہی مسئلہ ہے۔ اب لو مزے لاہور کی جوانی محبت کے۔'' انہوں نے سکوٹر کو ایک ٹھیلے میں لگنے سے بمشکل بچاتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ نے کبھی کسی دوسرے دیس بسنے کا نہیں سوچا!؟'' میں نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کے لیے اور اپنی توجہ کے ارتکاز

کے لیے پوچھا۔
''کس نے؟--- میں نے؟--- کیا بات کرتے ہو - یار، ہم کہیں اور رہ ہی نہیں سکتے۔'' وہ سکوٹر کا گیئر بدلتے ہوئے بولے۔
''ہم---؟'' میں نے وضاحت چاہی۔
''ہاں، ہم--- میرا مطلب ہے میں اور خالد احمد۔ کہیں اور جا رہنے کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہی مانوس ماحول ہماری زندگی ہے۔ ان شب و روز سے باہر ہمارے لیے جینے کے کچھ معنی نہیں۔ یہیں جوانی کے دن گزارے ہیں۔ بڑھاپا بھی یہیں بسر ہوگا۔ ویسے جوانی بھی کیا تھی ہماری۔ بڑھاپا ہی تھا، یار۔ یہی محسوس ہوتا رہا:

یہ جوانی تو بڑھاپے کی طرح گزرے گی
عمر جب کاٹ چکوں گا تو شباب آئے گا

.....

بہر حال، کچھ بھی ہو اب اس شہر کو، اس ملک کو چھوڑنا، اس سے بچھڑنا! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھو، سادہ سی بات ہے۔ اس کا تعلق طبیعت سے بھی ہو سکتا ہے اور عمر سے بھی۔ ہم اب عمر کے جس----''۔
نجیب احمد کہہ رہے تھے اور میرے ذہن میں ان کی غزل کا مطلع گونج رہا تھا:

کچھ اِس کے سوا خواہشِ سادہ نہیں رکھتے
ہم تجھ سے بچھڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے

.....

میں نے یہ شعر انہیں سناتے ہوئے کہا:
''آج مجھے آپ کا یہ شعر کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا - مگر آپ سچ سچ بتائیں یہ شعر تھا کس کے لیے؟ لاہور کے لیے یا خالد احمد کے لیے؟''
''شعر کھل جائے تو اچھا نہیں لگتا۔ جو حُسن چُھپنے میں ہے وہ آشکار ہونے میں نہیں۔ اچھا شعر ہر قاری پر اس کے ذوق اور فہم کی حد تک ہی کھُلتا ہے۔ اب تم جو چاہو سمجھ لو، جدھر چاہو، لے جاؤ اس شعر کو۔'' وہ کہہ رہے تھے۔
''لیکن خالد احمد تو کل شام اپنے ہاں حبیب الخیری کو اپنا ہاتھ دکھا کر پوچھ رہے تھے کہ ان کے ملک سے باہر جانے کے کیا امکانات ہیں؟ کیونکہ ان کے کئی ادبی دوست بیرونِ ملک اعلیٰ سرکاری اور سفارتی عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں۔'' میں نے جو بھی فوراً ذہن میں آیا کہہ دیا۔
'' پاکستان سے باہر جانا اور وہ بھی خالد احمد کا---!'' نجیب قہقہہ لگاتے ہوئے بولے: '' بھول جاؤ اس بات کو۔ پاکستان چھوڑنا تو ایک طرف خالد احمد لاہور سے باہر کیسے جئے گا یہ سوچنا بھی بہت مشکل ہے۔ میں نے کہا نا--- ہمارا ماحول ہی ہمارا مزاج ہے، ہماری سوچ ہے، ہمارا معمول ہے---''
''ہاں، خیری صاحب نے بھی خالد صاحب کا ہاتھ دیکھ کر ایسا ہی کچھ کہا تھا کہ ان کا

بیرونِ ملک سرکاری سفر ممکن تو ہے مگر اس کے لیے انہیں اپنی چال بدلنا ہوگی۔ اپنے حلقۂ احباب سے باہر بھی کچھ لوگوں سے رابطے کرنا ہوں گے۔ یہ ضروری ہے۔۔۔'' میں نے بات جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''خیری صاحب ایک جہاں دیدہ وکیل ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں خالد کو بھی اور اس کی چال کو بھی۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ۔۔۔ اور اصل بات یہ ہے کہ خالد احمد سب سے زیادہ سمجھتا ہے خود کو اور اپنی چال کو۔۔۔ وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ بس یونہی دل لگی کر رہا ہوگا مہمان سے۔۔۔ سچ یہ ہے کہ ہم جانا چاہیں بھی تو بچپن کے یہ آشنا راستے اب ہمارے پاؤں نہ چھوڑیں گے۔ ویسے بھی پاؤں اکھڑ جائیں تو مشکل ہی سنبھلتے ہیں۔ وہ جانتا ہے یہ:

زمیں پہ پاؤں ذرا احتیاط سے دھرنا
اکھڑ گئے تو قدم پھر کہاں سنبھلتے ہیں

.....

نجیب پورے یقین سے کہہ رہے تھے اور میں نجیب احمد کے مصرعوں میں الفاظ کے دروبست اور ان کی موزونیت پر حیراں و نازاں تھا۔ یہ سادگی، یہ گہرائی، یہ روانی گویا کوئی دریا اپنی موج میں آ گیا ہو:

کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا
سمندر تک اچھلتا جا رہا ہے

.....

پھر یوں ہوا کہ مجھ پہ ہی دیوار گر گئی
لیکن نہ کھل سکا پسِ دیوار کون ہے

.....

''میرا آپ سے شعری تعارف انہی اشعار نے کروایا تھا''۔ اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے میں بولا۔

نجیب احمد نے میری بات سنی ضرور مگر فوراً جواب نہ دے پائے کیونکہ مسلم ٹاؤن کا اشارہ آ گیا تھا اور وہ جھولتے جھالتے سست رو سکوٹر کو چوک سے پہلے روکنے کا ہدف پانا چاہتے تھے۔ سکوٹر رک گیا تو انہوں نے سانس کھینچی اور بولے:

''دیکھو، پاکستان میں دو ہی ہنر مند شاعر ہیں جن کا مصرعہ سازی میں جواب نہیں۔ کمال مصرعہ کہتے ہیں!''

''کون ہیں وہ دو ہنر مند شاعر؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔''

''ایک تو ہے احمد فراز۔ بھئی واہ، کیا مصرعہ کہتا ہے! ۔۔۔ ویسے تو پروین شاکر کی شاعری کے حسن میں بھی شک کی گنجائش نہیں تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ اس کی مقبولیت میں اس کی نسوانیت کا عمل دخل ضرور رہا اور اسے اس بات کا پورا ادراک تھا۔''

''اور دوسرا ہنر مند شاعر؟'' میرا تجسس بڑھ گیا تھا۔

''دوسرے کا نام احمد فراز سے پوچھ لینا وہ بتا

دے گا تمہیں۔ اب اپنا نام خود لیتے ہوئے اچھا لگتا ہوں میں کیا!؟" وہ بے ساختہ ہنس دیئے تھے۔ میں بھی مسکرا دیا مگر بات سنجیدہ تھی:

نہ کچھ کہتا نہ کچھ سنتا ہے کوئی
فقط پہلو بدلتا جا رہا ہے

.....

عجب اک معجزہ اس دور میں دیکھا کہ پہلو سے
یدِ بیضا نکلنا تھا مگر کاسہ نکل آیا

.....

بشر بے موت مارے جا رہے ہیں
مسیحائی کا چرچا ہو رہا ہے
ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں
ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے

.....

ایسے پُرتاثیر اشعار کے خالق کی بات کو سنجیدگی سے لینا بنتا ہے۔ ایسا سیدھا اور سادہ اسلوب اور ایسا وسیع اور گہرا جہانِ معنی! مجھے یاد آیا وہ جو نجیب احمد اور خالد احمد کی مشترکہ پچاسویں سال گرہ پر صاحبِ صدارت احمد ندیم قاسمی نے اپنے خطبہ میں کہا تھا وہ کتنا سچ تھا کہ نجیب احمد لفظوں کے گورکھ دھندے میں پڑنے کے بجائے سیدھا سادہ شعر کہتا ہے اسی سبب وہ سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ ہاں، انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خالد اور نجیب ان کی معنوی اولاد ہیں اور انہیں بہت عزیز ہیں۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ نجیب احمد، احمد فراز کی مصرعہ سازی کے معترف تھے تو یقیناً کوئی بات ہوگی کیونکہ نجیب شعر کی پرکھ میں بہت مشاق تھے۔ شعر کیا وہ تو ایک کم زور مصرعہ بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ طبعاً مہذب، شائستہ اور کم گو تھے مگر شعر پر رائے دیتے ہوئے ایسی صاف گوئی سے کام لیتے کہ مجھے بدلحاظی کا گمان گزرتا۔ فنی معیار پر کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ بات کرنے میں کھرے اور بے باک تھے۔ میرے سامنے کی بات ہے ایک نوجوان شاعر سے، جس سے لاکھوں کا کاروباری معاہدہ ہونے جا رہا تھا، صاف کہہ دیا کہ اس کی نظموں میں لاتعداد مصرعے غیر ضروری ہیں جو اس کی کم زور شاعری پر دلالت کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر ایسی صاف گوئی کی نہ وہ نوجوان توقع کر رہا تھا اور نہ میں۔

سیدھا سادہ شعر کہنا کار آساں نہیں۔ نجیب احمد باکمال ذخیرۂ الفاظ رکھنے کے باوصف شعر کو کبھی لفظی بوجھل پن کا شکار نہ ہونے دیتے۔ ورنہ ان پاس الفاظ کی کیا کمی تھی۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں ایک بار میری ایک نعت کے مطلع کے مصرعۂ اولیٰ میں خالد احمد کو ایک لفظ جچا نہیں۔ میں نے کئی متبادل لفظ تجویز کیے مگر خالد احمد مطمئن نہ ہوئے۔ آخر بولے: "اس شہر میں 'شہنشاہِ مترادفات' ہی اب تمہاری دستگیری کر سکتا ہے اور کوئی

نہیں۔ چلو، چلتے ہیں اس کے پاس۔''
احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، یزدانی جالندھری، ذوقی مظفر نگری اور صوفی افضل فقیر سے لے کر شہزاد احمد، خالد احمد اور خالد علیم تک ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے سبھی تو میری نگاہ میں تھے۔ وہ کس کی بات کر رہے ہیں کچھ سمجھ نہ آیا۔ پھر خالد احمد مجھے ساتھ لئے واپڈا ہاؤس سے نکلے اور 'بیاض' کے دفتر اور اپنے گھر سے ہوتے ہوئے واپس لکشمی چوک کے چائے خانہ پہنچے جہاں نجیب احمد بیٹھے تھے۔ خالد احمد نے مجھے کہا: ''نجیب کو مطلع سناؤ''۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ خالد احمد نے نجیب سے کہا کہ مطلع کے مصرعۂ اولیٰ کے اس ایک لفظ کو بدلنا ہے کوئی مترادف بتاؤ۔ نجیب نے جھٹ سے درجن بھر مترادفات کہہ ڈالے۔ خالد احمد نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولے: ''کیوں؟ کیا غلط خطاب دیا ہے میں نے اسے؟ اب چن لو ان میں سے موزوں ترین لفظ۔''

''لاؤ اب ایک سگریٹ نکالو --- جلدی سے۔'' نجیب احمد مترادفات بتاتے ہی خالد احمد سے مطالبہ کرنے لگے۔ انہیں بظاہر ہماری بات کا پس منظر جاننے میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔

''اوئے، کنجوس شیخا! کبھی اپنے پلّے سے بھی پی لیا کر سگریٹ۔'' خالد احمد کھلکھلاتے ہوئے اپنے دوست پر چوٹ کر رہے تھے۔ پھر نجیب کی طرف سگریٹ بڑھاتے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''اسے بتاؤ حامد کہ سگریٹ پینا صحت کے لیے کس قدر مضر ہے۔ یہ زہر ہے نرا زہر۔ میری تو سنتا نہیں یہ احمق---''

''لیکن ہم میں سے بڑا احمق کون ہوا وہ جو محض زہر پیتا ہے یا وہ جو نہ صرف پیتا ہے بلکہ اس پر پیسے بھی خرچ کرتا ہے؟۔

اس سے پہلے کہ خالد احمد جوابی حملہ کرتے نجیب نے آغا نثار کو ہاتھ پکڑا اور یہ کہہ کر چائے خانہ سے باہر کی طرف بھاگے کہ وہ ایک ضروری کام کر کے ابھی آتے ہیں۔

وہاں موجود سبھی دوست اس ہر روز کی دوستانہ نوک جھونک سے آج بھی لطف اٹھا رہے تھے اور میں خوش تھا کہ آج ''شہنشاہِ مترادفات'' سے بھی تعارف ہو گیا۔

تب ویسپا کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ دن بھی خواب و خیال ہو جائیں گے۔ خالد احمد رخصت ہو جائیں گے اور ان سے محبت بھری لڑائیاں اور مطالبے کرتے نجیب یہ کہتے ہوئے اچانک تنہا ہو جائیں گے کہ:

اڑ جائیں گے ہم بھی ورق خاک سے اک دن
رنگوں کے سوا کوئی لبادہ نہیں رکھتے

.....

کبھی سوچا نہ تھا کہ خالد احمد کی وفات کے بعد نجیب احمد کی طویل نظم ''ازل'' کی کمپوزنگ ہو رہی ہوگی تو عزیز شاعر دوست خالد علیم بتائیں گے کہ اپنے پیارے دوست کے جانے کے بعد نجیب احمد کے چہرے پر اور ان کے مزاج میں عجب اداسی کا رنگ اتر آیا ہے اور یہ بات مجھے کس قدر دکھی کردے گی۔ یا پھر یہ کہ نوید صادق سیّد آل احمد کے تاریخ ساز ادبی جریدہ ''کارواں'' کا نجیب نمبر شائع کریں گے اور پھر کینیڈا فون کر کے بتائیں گے کہ نجیب صاحب کو میرا مضمون بہت پسند آیا ہے اور یہ کہ اب نجیب صاحب کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ ہسپتال آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تب کس کے گمان میں رہا ہوگا کہ رضا صدیقی اپنے موقر ادبی چینل 'ادبستان' پر نجیب احمد کا جو انٹرویو نشر کریں گے وہ اس فن کار کا آخری انٹرویو ثابت ہوگا۔ اس بہت اہم اور تاریخی گفت گو کے ذریعہ ایک عہد کی ادبی تاریخ رقم ہو جائے گی۔

اڑ جائیں گے ہم بھی ورق خاک سے اک دن
رنگوں کے سوا کوئی لبادہ نہیں رکھتے

.....

سوچتا ہوں تاریخ ایک مخصوص وقت میں زندگی اور حالات کی دستاویز ہی تو ہوتی ہے۔ وقت چلتا رہتا ہے۔ تاریخ میں ڈھلتا رہتا ہے۔ کبھی رکتا نہیں۔ کہیں ٹھہرتا نہیں۔

''یہ رہا تمہارا پلاٹ۔۔۔ کیسا ہے؟'' نجیب احمد کا سکوٹر رک گیا تھا زمین کے ایک خالی ٹکڑے کے پاس اور وہ مظفر کو کانوں اور سر سے اتارتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''بس اب تم ہاں کرو تو مستریوں اور مزدوروں کو بلا کر تعمیر کا کام شروع کروا دیتا ہوں۔ کیا کہتے ہو؟''

''میں سوچتا ہوں کہ اس تعمیری جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے فی الحال کرائے کے مکان ہی میں نہ گذر بسر کرتا رہوں!'' میں نے تذبذب آمیز لہجہ میں جواب دیا تھا۔

''تمہاری مرضی! لیکن یقین کرو اپنے چھوٹے سے گھر کی چھت کے نیچے جو سکون کی نیند آتی ہے وہ کرائے کے وسیع مکان میں بھی نہیں آتی۔ تم خود محسوس کرو گے یہ۔ باقی جیسا تم کہو۔'' وہ نہایت دھیمے انداز میں رک رک کر کہہ رہے تھے جیسے اس جملے کے ساتھ وہ زندگی کی حقائق کا سفر بھی کر رہے ہوں۔

اور پھر کچھ روز بعد ہی وہ میری موجودگی میں مستریوں اور مزدوروں کو ہدایات جاری کر رہے تھے:

''اوئے، مسالے یا چنائی چہ ذرا دی گڑبڑ کیتی تے فیر دیکھ لینا۔ تہاڈی خیر نہیں۔ یاد رکھو اسیں کوئی مکان نئیں بنا رئے گھر بنا رئے آں گھر۔ اوئے کجھ سمجھ آئی جے کہ نئیں۔''

مرزا حامد بیگ، حامد یزدانی، خالد احمد اور زاہد مسعود۔

اور ہاتھوں میں بجری اور سیمنٹ کے ملغوبے سے بھری بالٹی اٹھائے بے چارہ مزدور حیراں حیراں آنکھوں سے نجیب احمد کو تکتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

اپنے پہلے گھر کی تعمیر کی یادوں سے پھوٹتی ان سطور کو رقم کرتے ہوئے میرا دل اس یقین سے روشن ہے کہ "ازل" کا خالق اور احباب کے سکون کا خیال رکھنے والا نجیب احمد اپنے ممدوحِ مکرم احمدؐ مرسل کے طفیل اپنے ابدی گھر میں پُرسکون اور آسودہ ہوگا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اللہ کی کی حمد اور اس کے محبوب پیغمبرؐ کی ثنا کے نور آثار دریچوں سے آشنائی رکھنے والے کی ذات اور فکر کب مجسم روشنی میں ڈھل جائے، کون کہہ سکتا ہے۔ یہ اللہ کے کام ہیں اور اس کے حکم سے سب کچھ ممکن ہے۔ صدا بھی اسی کی ہے اور خامشی بھی۔ روشنی کا مالک بھی وہی ہے اور خاک کا بھی۔ اسی دائم و باقی کے مقربین نے انسان کو یہ آگاہی بخشی کہ صرف اور صرف باقی کی محبت ہی فنا کے خوف سے آزادی کی ضامن ہوسکتی ہے۔ مکتوباتِ ربانی میں آتا ہے کہ خاک ہی وہ عنصر ہے جو روشنی کو جذب کر کے بھی اپنی اصل پر قائم رہنے کی خاصیت رکھتا ہے۔ اسی لیے خاکی فن کار مر کر بھی نہیں مرتا۔ نجیب احمد کی یادوں کی خنک روشنی بھی ان کی محبت کی طرح پائدار ہے۔ ان کی فکر ہمارے ذہن و دل کی سرزمیں پر ہمیشہ یونہی مہکتی اور چمکتی رہے گی کیونکہ روشن ہستیوں کے نوری تذکار سے روشنی کشید کرتی ہوئی وہ خود بھی روشنی میں ڈھل چکی ہے اور نجیب احمد ہمیں بتا گئے ہیں کہ:

روشنی خاک میں تحلیل نہیں ہوسکتی

☆☆☆☆☆

یار سلیمی یار نجیب

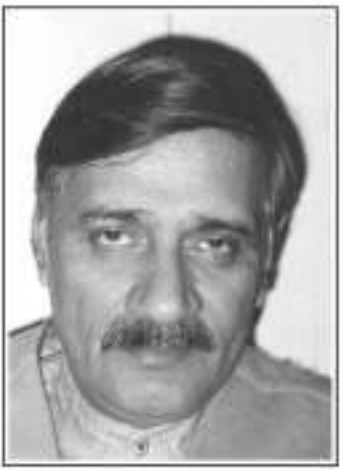

بچھڑنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔
بچھڑنے والا کسی بھی موڑ پر ہاتھ چھڑا کر رخصت ہو جاتا ہے۔

داستاں آغاز کرتا ہوں ۔ پچھلی صدی کی سترھویں دہائی تھی ۔ ایک دوست ضیا اللہ ضیا (بعد میں ضیا نیر) اصرار کے مجھے شاہد شیدائی سے ملانے کے لیے اُس کے گھر لے گیا۔ دھوتی پہنے دیہاتی سے شاہد شیدائی کے پاس پنٹ شرٹ میں ملبوس ایک اور شخص شفیق بیٹھا تھا۔ شاہد شیدائی نے شفیق سلیمی کے نام سے اُس کا تعارف کروایا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد یہ طے ہوا کہ اگلے ہفتے شاہد شیدائی ہمیں رائٹرز گلڈ کے دفتر میں کچھ ادبی لوگوں سے متعارف کروائے گا۔

حلقۂ اربابِ غالب کا ہفتہ وار اجلاس وہیں ہوتا تھا۔ مگر ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ خالد احمد، نجیب احمد، زمان کنجاہی اور قائم نقوی تاہم وہیں بیٹھے تھے۔ چاروں نے شفیق سلیمی کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا..... ''اوئے بڈھیا شیرا توں کتھوں؟''
مجھے قدرے حیرانی ہوئی۔ پھر پتا چلا کہ شفیق سلیمی ادبی دنیا میں نو وارد نہیں۔ وہ تو ادبی برادری کا ایک فعال رُکن تھا مگر راستہ بھول کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ادبی دنیا میں شفیق سلیمی کی یہ دوسری انٹری (Entry)

اسلام عظمی

تھی۔اور وہ (شاید) اس لیے ہمارے ساتھ وہاں چلا آیا تھا کہ شاید اُسے نکال کر کچھ کھا رہے ہوں لوگ۔وہ ائرفورس کے سابق ائیر مارشل اصغر خاں کے بھائی بریگیڈیر اسلم خاں کے مرغی خانہ ''آربر ایکرز'' میں بطور محاسب ملازم تھا۔ میں مغلپورہ سے آگے لال پل میں مقیم تھا۔ یہ علاقہ شفیق سلیمی کا دیکھا بھالا تھا کہ کچھ پیشتر ایوارڈ یافتہ مصور اسلم کمال وہاں رہائش پذیر تھا۔ شفیق سلیمی اور کئی دوسرے ادبی لوگ اس کے پاس جمع ہوا کرتے تھے۔میرے دفتری ساتھی چودھری نذیر نے بتایا کہ اُس کا ہمسایہ ایک مصور تھا اور عورتیں اس کی نصف بہتر کو ''شہکار'' کے نام سے پکارتی تھیں۔

شفیق سلیمی اپنی رہائش (دروغہ والا) سے دفتر آنے جانے کے لیے شالامار جانے والی پکی سڑک اختیار کرتا تھا۔ جب اُسے پتا چلا کہ میں بنی پورہ لال پل میں مقیم ہوں تو واپسی پر وہ میرے پاس رُکنے لگا۔ آتے وقت اس کے ہاتھ دو اور تین زردیوں والے انڈوں کا تھیلا ہوتا۔ گپ شپ کے بعد واپسی پر وہ کھیتوں کے درمیان سے اسکوٹر بھگاتے ہوئے دروغہ والا پہنچ جاتا۔

لکھاریوں میں سے دوسرا اسکوٹر والا عطا الحق قاسمی تھا۔ حسن رضوی کے پاس کار تھی اور اس کے بارے اختر کاظمی نے کئی ''جوک'' گھڑ رکھے تھے۔ایک عجیب دور تھا۔ پھر حلقہ ارباب غالب کا اجلاس دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں ہونا شروع ہو گیا۔لائبریری کی کھڑکی سے خالد احمد کے گھر کا دروازہ نظر آتا تھا۔ شفیق سلیمی نے بتایا کہ احمد ندیم قاسمی بھی وہیں رہتے ہیں۔ اگلی گلی میں نجیب احمد کا گھر تھا۔زمان کنجاہی کے بعد قائم نقوی حلقے کا سیکریٹری بنا۔ اجلاس کے بعد نسبت روڈ کے ڈھابے پر سبھی لوگ چائے پینے بیٹھ جاتے۔ اختر کاظمی کے جوک اور خالد احمد کے قہقہے ایک ساتھ چلتے رہتے۔ نجیب احمد عمومی طور پر خاموش طبع بندہ تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق بہت ہوتا تو وہ مسکرا دیتا۔ خالد احمد اور نجیب احمد.....عطاء الحق قاسمی اور گلزار وفا چودھری دو مشہور جوڑیاں تھیں۔ یہ جوڑیاں بھی عجیب ہیں ٹوٹتی ہیں تو ٹرک کی آواز بھی نہیں آتی۔ رفاقتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ میرے اور شفیق سلیمی کے بارے میں کاتبِ تقدیر نے اپنے رجسٹر میں شاید کچھ اور لکھ رکھا تھا۔ میں متحدہ عرب امارات پہنچا اور اگلے سال ہی شفیق سلیمی بھی وہاں آ گیا۔ یوں ایک ایسی رفاقت شروع ہوئی جو اپریل ۲۰۲۱ تک ایسی چلی کہ چل سو چل۔ متحدہ

عرب امارات سے ہماری واپسی بھی یکے بعد دیگرے ہوئی۔ شفیق سلیمی، ڈاکٹر زبیر فاروق، منور عزیز، سعید کوکب اور میری مشترکہ مفادات کونسل وجود میں آ گئی۔ ایک غیر فانی سا تعلق بن گیا۔ حلقہ ارباب غالب کے اجلاس ہی میں شفیق سلیمی نے اپنی شہرہ آفاق غزل ...... بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے/ اب لوٹ آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے۔ خالد احمد نے جھٹ سے اسی عنوان سے امروز میں کالم لکھ مارا۔ میرے غیر ادبی دفتری ساتھی عبدالستار نے کالم پڑھا اور اخبار مجھے دکھا کر کہا..... تیرے یار شفیق سلیمی نے تو کمال کی غزل کہہ ڈالی ہے۔ اور پھر ایسے ہی ہوا۔ شفیق سلیمی کے کہیں پہنچنے سے پہلے یہ شعر وہاں پہنچ جاتا۔ تیس سال کی خود ساختہ جلا وطنی کے بعد واپس آئے تو پرانا ''مرکزہ'' جیسے بحال ہو گیا۔ خالد احمد کے گرد نئے پرانے سبھی لکھاریوں کا جھرمٹ لگا رہتا۔ مجھے اور شفیق سلیمی کو زعم سا رہا کہ ہم خالد احمد کے بہت قریب ہیں۔ خالد احمد کے قریب تر نجیب احمد تھا۔ بیرونِ ملک سیکڑوں مرتبہ میں نے خالد احمد کے اشعار...... ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ میں/ پھر بھی یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ میں...... اور...... کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے/ اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے۔ جہاں کہیں بھی خالد احمد کا تذکرہ ہوا میں نے نجیب احمد کے یہ اشعار ضرور سنائے:

وہ قوسِ قوس مجھ کو اندھیروں میں یوں ملا
ہاتھوں کی پور پور میں بینائی آ گئی
پتوں پہ رخصتی کی رسومات قرض تھیں
پاگل ہوا کے ہاتھ میں شہنائی آ گئی

....

دستور یہ ہے کہ فروری کے اواخر میں خزاں رخصت چاہتی ہے۔ اور مارچ کا مہینہ آمدِ بہار کی نوید سناتا ہے۔ شگوفے کھلتے ہیں۔ کلیاں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ پھول لبھانے لگتے ہیں۔ اپریل ربیع کا آغاز ہے۔ ربیع سے ربیعہ کا لفظ نکلا ہے۔ ''ربیعہ'' کے حوالے سے شورش کاشمیری نے کیا کیا ظالم شعر کہے تھے۔ کچھ لوگ اپنی ذات میں عہد ہوتے ہیں۔ مجھے اعزاز ہے کہ میں نے انھیں دیکھا۔ اپنے بارے میں اپنی آپ بیتی '' آؤٹ سائیڈر'' لکھ چکا ہوں۔ میرا ایک شعر ہے۔

مڑ کے دیکھا ہے جو آغاز سفر کی جانب
راستے اور بھی دشوار نظر آتے ہیں

....

مڑ کے دیکھنے کی نہ تو اب روایت ہے اور نہ ہی ہمت۔ یار سلیمی تو ہمتیں بھی ساتھ لے گیا۔ مگر

اُمید ہے کہ درجن بھر کتابیں تو آخری مراحل میں ہیں، ضرور چھپیں گی۔ اللہ رب العزت کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ کسے علم تھا کہ اس سال بہار و خزاں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ کورونا کی وجہ سے دوستوں کی آپسی ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہے۔ باہر نکلنے سے مجھے میری کمزور قوت ساعت روکتی ہے۔ آخر آخر شفیق سلیمی بھی گھر سے کم کم نکلتا تھا۔ شفیق سلیمی کی رحلت سے دس پندرہ روز پہلے، میں اور ممتاز راشد شفیق سلیمی کے سب سے بڑے بھائی کی تعزیت کے لیے گئے۔ وہ قدرے کمزور ہو چکا تھا مگر ہمت جوان تھی۔ دو چار دنوں کے بعد ڈاکٹر زبیر فاروق نے متحدہ عرب امارات سے اطلاع دی کہ سلیمی صاحب ہسپتال میں ہیں اور کسی کو اُن سے ملنے کی اجازت نہیں۔ کوئی چھ سات روز تک آپسی پیغامات کا سلسلہ چلتا رہا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کی خبر آ گئی۔ کرونا نے رتیں ہی بدل دی ہیں۔ شفیق سلیمی کے جنازے میں لکھاریوں میں سے چند لوگ ہی پہنچے۔ اُس کی بیٹیوں کو تعجب ہوا کہ باپ کے دوست کہاں گئے! .....دستور تو یہ تھا کہ کسی خوشی میں شرکت ہو نہ ہو.....غمی ساجھی ہوتی ہے۔ میاں محمد بخش نے کہا تھا.....دشمن مرے تے خوشی ناں کریے سجناں وی مر جانا۔

پنجابی روایت کے مطابق تعزیت کے لیے آنے والوں میں دوست دشمن کی تمیز نہیں ہوتی۔ آنسو ہر آنکھ سے رواں ہوتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب بدل گیا ہے۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو انگلیاں موبائل فون سے کھیلنے لگتی ہیں۔ اور ہوتا کیا ہے؟ اپنوں پرایوں کی رُخصتی کی خبریں لاچار کرنے لگتی ہیں۔ نجیب احمد سال بھر سے بیماری میں گھرا ہوا تھا۔ پھر بھی یقین تھا کہ نجیب احمد غالب کی طرح وبا کے گرفت میں غالب میں نہیں آئے گا..... سخت خیراں رہیں گی۔ شفیق سلیمی اور نجیب احمد سے پہلی ملاقات میں چند دنوں کا وقفہ تھا۔ کوئی پنتالیس سالوں کی شناسائی چند ہی دنوں کے وقفے سے اختتام پذیر ہوگئی۔ دوستی کی ڈور تڑک کر کے ٹوٹ گئی۔ میں دونوں کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ تعزیتی سطریں دراصل اپنا نوحہ ہوتی ہیں۔ اللہ رب العزت سارے بچھڑے ہوئے دوستوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ یار شفیق سلیمی، یار نجیب احمد ہمیں چھوڑ کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ دوست عمران منظور.....دوست نعمان منظور.....عزیزم جاہد احمد۔ راضی بہ رضا رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ ہے کیا!

☆☆☆☆☆

شفیق سلیمی کی رحلت

کسی شاعر کی زندگی میں اس کا کوئی ایک شعر عالمی شہرت حاصل کر لے اور اس کی خاص پہچان بن جائے تو یہ اس کی شعری خوش بختی کی علامت ہوتا ہے۔ شفیق سلیمی بھی ایسے ہی خوش قسمت تھے اور اُن کا یہ مطلع کوئی نصف صدی تک کی ان کی زندگی میں ان کا خصوصی شعری حوالہ بنا رہا:

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لَوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

.....

شفیق سلیمی پریت نگر (امرتسر) کے ایک ارائیں گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش 21 دسمبر 1942 ہے۔ ان کے والد وہاں مسلم لیگ کے ضلعی صدر تھے، تحریک پاکستان عروج پر تھی۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان قائم ہوا تو فسادات کے سبب اس گھرانے کو ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور آنا پڑا مگر جلد ہی یہ کنبہ گوجرانوالہ میں جا بسا۔ شفیق سلیمی نے تیسری جماعت تک گوجرانوالہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور

ممتاز راشد لاہوری

پھر یہ گھرانہ کوٹ رادھا کشن میں آباد ہو گیا۔ شفیق سلیمی کے چھ بھائی تھے۔ سب سے بڑے سے چھوٹے سی ایم اے میں ملازم تھے اور کرشن نگر لاہور میں رہتے تھے۔ شفیق سلیمی سمیت ان کے بھائی باری باری ان کے پاس کرشن نگر لاہور میں آ کر رہتے رہے اور اعلیٰ تعلیمی مراحل تک پہنچتے رہے۔ وہ بھائی چودہ مارچ 2021 کو تقریباً 99 سال کی عمر میں ڈیفنس لاہور میں فوت ہوئے، میں اور افسانہ نگار اسلام عظمی تعزیت کے لیے جانا چاہتے تھے۔ فون پر میری شفیق سلیمی سے بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ آج 15 مارچ کو تو میں ایکسپو سنٹر جوہر ٹاؤن لاہور میں کرونا وائرس کی ویکسین کا پہلا ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں، آپ کل آ جائیں۔ سولہ مارچ کو میں آصف بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے اپنے گھر سے نکلا، اسلام عظمی اپنے گھر نزد جاوید مارکیٹ رحمان پورہ روڈ اچھرہ سے پیدل نقشہ شاپ (وحدت روڈ) پر آ گئے تھے۔ ان کو لے کر کار کا رُخ لاہور کینٹ کی طرف موڑا۔ ڈیفنس موڑ (والٹن روڈ) سے ہم نیو سپر ٹاؤن کی گلی نمبر 2 میں گئے اور گلی نمبر 7 میں شفیق سلیمی کے ہاں جا پہنچے۔ ان سے ان کے بھائی کی تعزیت کی۔ وہ قدرے علیل دکھائی دیئے پھر بھی بھائیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ان کے چھوٹے بھائی، معروف شاعر جلیل عالی کرونا میں مبتلا ہونے کے سبب پنڈی سے پرسوں بڑے بھائی کے جنازہ میں لاہور نہ آ سکے تھے۔ جلیل عالی نے کچھ روز قبل اپنے تنقیدی مضامین پر مشتمل نئی کتاب ''شعری دانش کی دُھن میں'' کی کچھ کاپیاں لاہور کے اہلِ ادب کے لیے بھجوائی تھیں، شفیق سلیمی نے ایک ایک نسخہ مجھے اور اسلام عظمی کو دیا، اسلام عظمی کو اضافی کاپی شاہد شیدائی کے لیے دی اور مجھے ایک اضافی کاپی حسین مجروح صاحب تک پہنچانے کے لیے دی جو میں نے اگلے روز زینب سنٹر لنک ماڈل ٹاؤن لاہور میں ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کے دفتر میں جا کر حسین مجروح تک پہنچا دی اور انھوں نے اُسی وقت جلیل عالی کو فون کر کے شکریہ بھی ادا کر دیا۔ شفیق سلیمی سے مذکورہ بالا ملاقات ہماری آخری ملاقات ہی ثابت ہوئی کہ اگلے ہفتے برین ہیمرج کے سبب وہ سی ایم ایچ لاہور کینٹ کے آئی سی یو میں چلے گئے اور دو اپریل 2021 کو ان کی

وفات کی اطلاع آ گئی۔ اُسی روز نامور لوگ گلوکار شوکت علی کی وفات کی خبر بھی آ گئی اور پھر فیس بک پر ان دونوں کے لیے تعزیتی پوسٹوں کی لائن لگ گئی۔ شفیق سلیمی کی نماز جنازہ عشا کے بعد اور شوکت علی کی نماز جنازہ رات دس بجے ہوئی۔

شفیق سلیمی کوئی ربع صدی تک ابوظہبی میں رہے۔ مارچ 1988 میں وہاں احمد ندیم قاسمی کی ستر ویں سالگرہ کا تین روزہ جشن منایا گیا۔ میں اور رشید نیاز قطر سے گئے تھے۔ دوبئی، ابوظہبی اور شارجہ میں عالمی مشاعرے بھی پڑھے۔ وہیں شفیق سلیمی اور ان کے شاعر دوستوں کی ٹولی سے بے تکلف ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر ہم نے انھیں ایک بار قطر بھی بلایا اور وہاں بھی کچھ روز مشاعرے برپا رہے۔ اسلام عظمی بھی ان کی ٹولی کا حصہ تھے، وہ تب کوئی ڈیڑھ سال کے لیے قطر آ گئے تو انھوں نے شفیق سلیمی کی اتنی باتیں بتائیں اور اُن سے سنے ہوئے اتنے لطیفے سنائے کہ شفیق سلیمی ہمیں ازبر ہو گئے تھے۔ دوبئی کے نامور عرب نژاد اردو شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق شفیق سلیمی کے شاگرد خاص تھے اور پھر ان ہی کی عنایت خاص سے ڈاکٹر زبیر فاروق کے ستر سے زائد شعری مجموعے آئے جو کہ اپنی جگہ ایک ریکارڈ ہے۔ ڈاکٹر زبیر فاروق کو حکومت پاکستان کے تمغۂ امتیاز بھی ملا۔ شفیق سلیمی واپس لاہور آ چکے تھے، میں بھی بسلسلہ روزگار قطر میں 37 سال گزار کر اپریل 2014 کو لاہور واپس آ گیا تھا۔ اب شفیق سلیمی سے اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں۔ لاہور میں کئی مشاعرے ان کے ساتھ پڑھے۔ ملتان کے ایک مشاعرے کے لیے ہم گاڑی میں ہم سفر بھی رہے اور اس دوران ان کی ظرافت طبع کے اور جوہر بھی کھلے۔ ان کا شعری مجموعہ 'تمازت' کے نام سے آیا تھا۔ ہم نے اپنی ادبی تنظیم ''ادارۂ خیال و فن'' کے زیر اہتمام لاہور میں اہم شعرا کی شامیں منانے کا سلسلہ شروع کیا تو 2017 میں شفیق سلیمی کے ساتھ بھی اکادمی ادبیات پاکستان کی لاہور شاخ (آصف ہلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) میں ایک بھرپور ادبی تقریب منعقد کی تھی۔ شفیق سلیمی نے کوئی 78 برس عمر پائی۔ وہ 'فنون' اور 'بیاض' میں اکثر چھپتے تھے۔ 'بیاض' اور ہمارے سہ ماہی 'خیال و فن' میں ان کے خصوصی گوشے بھی شائع ہوئے۔

اللہ انھیں روح کی آسودگی بخشے۔

☆☆☆☆☆

لے او یار حوالے ربّ دے۔۔۔

بینک کی ملازمت کا نیا نیا آغاز تھا۔ ہمارا سٹاف کالج راولپنڈی سے پشاور منتقلی کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ یوں ہمارا تربیتی کورس قدرے التوا کا شکار ہو گیا۔ سو ہمارے گروپ کے زیرِ تربیت آفیسرز کو بینکنگ کی عملی تربیت کے لیے عارضی طور پر پنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہروں کی مختلف شاخوں میں بھجوا دیا گیا۔ ہماری منزل اسلام آباد کی مین برانچ ٹھہری۔ برانچ مینیجر کو رپورٹ کی تو انھوں نے ہمیں متعلقہ سیکشن کے آفیسر انچارج کے پاس بھیج دیا۔ ان صاحب سے پہلی ملاقات ایک خوشگوار لمحہ تھا۔

سانولی سلونی رنگت، دراز قامتی کی طرف مائل بھرا بھرا بدن، فوجی طرز میں تراشے گئے قدرے گھنگھریالے بالوں کے درمیان سے نکلی مانگ، گھنی ہموار سیاہ مونچھیں، بولتی ہوئی روشن آنکھیں، چہرے پر خوشگوار سنجیدگی، سفید براق کاٹن کا کلف لگا سوٹ اور تازہ پالش کیے چمچماتے مکیشن کے جوتے۔ ہمارا پہلا تاثر یہ تھا کہ اِن صاحب کی بیگم بہت سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون ہوں گی۔ یہ الگ بات کہ دو چار دنوں کے بعد قدرے بے تکلفی کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ جہلم کی معزز راجپوت فیملی سے تعلق رکھنے والے یہ جوانِ رعنا راجا جاوید اختر تو ابھی تک کنوارے ہیں۔ تاہم اطمینان کی بات یہ ہے کہ بعد میں جب اُن کی شادی ہوئی تو

نذر عابد

ہماری بھابی نے ہمارے اوّلین تاثر کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔

کنوار پنے کا ایک واقعہ جاوید صاحب دوستوں کو بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ ایک بار بینک کے ہیڈ آفس سے تمام زونل دفاتر کو احکامات جاری ہوئے کہ ہر زون سے تعلق رکھنے والے غیر شادی شدہ افسران کی فہرستیں بھیجی جائیں تا کہ ضرورت کے مطابق ان کے تبادلے آزاد کشمیر کی دُور دراز برانچوں میں کیے جا سکیں۔ اتفاق سے جاوید صاحب کا تبادلہ اُنھی دنوں سرگودھا زون سے اسلام آباد زون میں ہوا تھا اور وہ اپنے نئے زونل آفس میں رپورٹ کرنے سے پہلے تبادلے پر ملنے والی معمول کی چھٹی پر تھے۔ گویا پچھلے زون کے ریکارڈ سے اُن کا نام خارج ہو چکا تھا جب کہ نئے زون میں ابھی اُن کے نام کا اندراج ہی نہیں ہوا تھا۔ یوں "نہ میں اِدھر تھا، نہ میں اُدھر تھا تو میں کدھر تھا" والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دونوں زونل دفاتر سے جاری ہونے والی فہرستوں میں جاوید صاحب کا نام نہیں تھا۔ اِس طرح وہ آزاد کشمیر کی کسی دُور دراز برانچ میں تبادلے سے اپنے کنوار پنے سمیت بال بال بچ گئے۔

بینک کی ملازمت کے ابتدائی دنوں میں جاوید صاحب کے ساتھ کام کرنا ہمارے لیے ایک خوشگوار اور یادگار تجربہ ثابت ہوا۔ دورانِ کار اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا اور ہر معاملے میں انھیں مہربان و مددگار بھی پایا۔ دفتروں میں سینیئرز کا عمومی رویّہ یہ ہوتا ہے کہ جونیئرز کی بہتر کارکردگی پر تعریف میں بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس جاوید صاحب اپنے ماتحت کے کسی بھی کام کی بروقت اور سلیقے سے تکمیل پر تعریفوں کے پل باندھ دیتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ اپنے مخصوص پنجابی سٹائل میں ایک جملہ کہنا کبھی نہ بھولتے:

"وٹ کڈ دتے نیں بادشاہو!"

اُن کے ساتھ یہ پیشہ ورانہ رفاقت تو محض پانچ چھے ماہ کی رہی لیکن اُن کی خلوص بھری دوستی برسوں پر پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ ہماری طرف سے بینک کی ملازمت ترک کر دینے کے بعد بھی اُن کے ساتھ فیملی مراسم پختہ تر ہوتے چلے گئے۔

جاوید صاحب کو بینکنگ کا وسیع تر تجربہ تھا۔ وہ فیلڈ بینکنگ، آؤٹ اینڈ انسپکشن اور اسلامک بینکنگ جیسے شعبوں میں انتہائی محنت، پیشہ ورانہ لگن اور مہارت سے کام کرتے ہوئے سینیئر وائس پریذیڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔ وہ نظری و عملی ہر دو حوالوں سے نظامِ بینکاری کا فہم و ادراک رکھنے والے کامیاب بینکر تھے۔ انھوں نے قومی و بین الاقوامی سطح پر بینکاری کے متعدد کورسز پاس کر رکھے تھے۔ ملازمت کے دوران میں وہ جہاں بھی رہے، انتہائی محنت

اور محبت سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ پیشہ ورانہ دیانت کا عالم یہ تھا کہ بینک سے سبکدوشی کے بعد جب کچھ عرصے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کی ایک یونیورسٹی سے مالیاتی امور کے ایڈوائزر کی حیثیت سے منسلک تھے تو صحت کی خرابی کے پیشِ نظر یہ ملازمت چھوڑنا چاہی، انتظامیہ نے اُسی پیکج پر ہفتے میں صرف دو دن کام کرنے کی پیشکش کر دی لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یوں میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا کہ کام تو ہفتے میں دو دن کروں اور تنخواہ ہفتے بھر کی لیتا رہوں۔

جاوید صاحب کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ حتی الوسع خالص پنجابی بولتے تھے۔ کبھی مجبوری کے تحت اردو یا انگریزی بولنی پڑ جائے تب بھی پنجابی کا تڑکا لگاتے رہتے تھے۔ اُن کا یہ انداز گفتگو دوستوں کو اور بھی بھاتا تھا۔ دیہی کلچر سے گہری آگہی کا نتیجہ تھا کہ انھیں پنجابی زبان کی ضرب الامثال اور کہاوتیں کثرت سے ازبر تھیں اور دورانِ گفتگو اُن کا بروقت اور برمحل استعمال کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے اُن کی گفتگو میں مزید مٹھاس اور دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ دفتر میں خالص پیشہ ورانہ اجلاسوں میں بھی اُن کا طرزِ گفتگو یہی رہتا جو اُن کے رفقائے کار کے درمیان مقبولیت کا باعث تھا۔ معروف صوفی شاعر میاں محمد بخشؒ کے پنجابی کلام ''سیف الملوک'' میں سے انھیں متعدد مصرعے اور اشعار یاد تھے جو اکثر موقع و محل کی مناسبت سے پڑھتے رہتے تھے۔

جاوید صاحب حسد اور رقابت کے جذبے سے یکسر بے نیاز تھے۔ اُن کی طرف سے اپنے جونیئرز کی حوصلہ افزائی کا تذکرہ پہلے ہو چکا۔ اِس کے علاوہ وہ اپنے رفقائے کار اور دوستوں کی ہر کامیابی پر ایسے خوش ہوتے جیسے یہ اُن کی اپنی کامیابی ہو۔ دوستوں کی ہر کامیابی کی فخریہ انداز میں خوب تشہیر کرتے۔ ہمیں یاد ہے ہماری پی ایچ ڈی کی تکمیل پر اُن کی یہی کیفیت تھی۔ کئی دوستوں کو فون کر کر کے یہ خوش خبری سناتے رہے۔ بعد میں بھی اپنے کسی دوسرے دوست سے تعارف کرواتے تو پی ایچ ڈی کا اعزاز رکھنے والوں کی فضیلتوں پر اتنی تفصیلی روشنی ڈالتے کہ ہم اپنی جگہ شرمندہ سے ہونے لگتے۔

اُن کا یہ والہانہ انداز نہ صرف اُن کی اپنے دوستوں سے پُرخلوص محبت کی غمازی کرتا ہے بلکہ اِس سے اُن کی اعلیٰ ظرفی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ دوستی نبھانے کا ہنر جانتے تھے۔ جس سے ایک بار دوستی ہو جائے تو پھر اُس پر ساون بھادوں کی طرح برستے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اُن کی دوستی اپنے کسی دوست سے محض اُس کی ذات تک محدود نہیں رہتی تھی بلکہ اُس کے خاندان کے دیگر افراد سے بھی کسی نہ کسی حد تک ایسے تعلقات

اُستوار کر لیتے تھے جن کی بنیاد خلوص بھری بے غرض اور بے لوث محبت پر قائم ہوتی۔ اُن کے مزاج میں دراصل احتیاط کا عنصر نمایاں تھا۔ چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنا اُن کی فطرت کا خاصہ تھا۔ ایک بار اُنھوں نے اپنے ذاتی کاغذات کی ایک فائل ہمیں دکھائی جس میں وہ لفافہ بھی اپنی جگہ ترتیب سے لگا ہوا تھا جس میں انھیں کئی برسوں پہلے ملازمت کا تقرر نامہ ملا تھا۔ کسی ایسے مقام پر جانا ہوتا کہ میزبان کے گھر تک پہنچنے میں راستہ قدرے غیر ہموار یا تنگ ہوتا تو گاڑی خاصی دور ہی کھڑی کر دیتے اور بقیہ مختصر راستہ پیدل ہی طے کرتے اور ہر دیر بعد کسی نہ کسی کو بھیج کر گاڑی کی خیر خبر لیتے رہتے۔ اپنی ذات سے منسوب ہر شے، ہر انسان کے حوالے سے اُن کا یہ احتیاطی رویہ ہمیشہ برقرار رہا۔ شاید اسی طبعی تقاضے کے تحت وہ دوستیوں کو بھی مینت مینت کر رکھتے تھے۔ بقول انیس:

خیال خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

.....

دوستی کے اِن آبگینوں کی وہ عمر بھر حفاظت کرتے رہے اور بدلے میں وہ خود بھی تمام عمر اپنے دوستوں کی محبتیں سمیٹتے رہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ حج کے مبارک سفر پر گئے تو مدینہ شریف قیام کے دوران میں انھیں دل کی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹروں نے بائی پاس کا علاج تجویز کیا۔ چنانچہ مدینہ طیبہ ہی میں اُن کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی۔ گویا آقائے نامدار کے شہر کی مقدس فضاؤں میں قدرت کی طرف سے اُن کے دل کی ظاہری و باطنی ہر دو طرح کی پاکیزگی کا اہتمام کر دیا گیا تھا۔

دل کے کامیاب آپریشن کے دو تین سال بعد تک وہ اللہ کے فضل و کرم سے روبصحت رہے۔ ہنستے کھیلتے دوستوں سے ملتے ملاتے رہے۔ اُن کے غم خوشی میں شریک ہوتے رہے۔ ہشاش بشاش تھے کہ جنوری ۲۰۲۱ کے تیسرے ہفتے میں اچانک اُنھیں دوبارہ دل کا دورہ پڑا۔ ہفتہ بھر ہسپتال میں رہے لیکن اِس بار وہ جانبر نہ ہو سکے اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

۲۶ جنوری کی سہ پہر کو اُن کی لحد کو مٹی دیتے ہوئے ہم سوچ رہے تھے کہ زندگی میں جاوید صاحب جیسے پیارے لوگوں سے دوستی کیوں ہو جایا کرتی ہے کہ پھر بشرطِ حیات اُن کے وچھوڑے کا دکھ عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے۔ جاوید صاحب کی لحد پر جب گلاب کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھیں تو ہمیں اُن کے پسندیدہ شاعر میاں محمد بخشؒ کا شعر بے طرح یاد آ رہا تھا:

لے او یار حوالے رب دے میلے چار دناں دے
اس دن عید مبارک ہوسی جس دن فیر ملاں گے

☆☆☆☆☆

پہلی نظر کا فریب

بلقیس ریاض

ایک خوبصورت بنگلہ پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر ہوا تھا کچھ فاصلے پر اُسی پہاڑی کے ذرا پیچھے ایک آبشار بہتی تھی اور پہاڑی کے آس پاس چند بنگلے اور بھی تھے۔ راہگیر سڑک پر چلتے ہوئے اس آبشار سے اپنی پیاس بجھاتے ہر بنگلے کی ایک اپنی ہی کہانی تھی۔

پہاڑی کی چوٹی پر روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ہر بنگلہ ایک روشن ستارہ دکھائی دیتا۔

صبح کے وقت انہی میں سے ایک بنگلے کی مکین ستارہ بڑی ہی احتیاط سے قدم بڑاتے ہوئے جب نیچے اُترتی اور سڑک پر پہنچ کر ڈرائیور کا انتظار کرتی جو گیراج سے گاڑی نکال کر اس کے قریب لاتا اور وہ اُسکو سلام کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر کالج پہنچ جاتی۔ اور معمول کے مطابق کلاسیز اٹینٹ کرتی۔ معمول کے مطابق کلاسز اور وقت کے مطابق پارکنگ کی جانب پہنچ کر فضلو کا انتظار کرتی جونہی وہ گاڑی لاتا تو چپ چاپ بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہو جاتی۔ ایک دن اوپر کی طرف جانے ہی والی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''سنیئے''

وہ رک گئی اور مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان لڑکا

کھڑا تھا۔

''کہیے'' ستارہ نے پوچھا۔

''میں نے آج آپ کو کالج میں دیکھا تھا مگر خیال ہی نہیں تھا کہ آپ بھی یہاں رہتی ہیں۔''

''کیا مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

''نہیں..... ایسی بات نہیں ہم حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے ہیں کم لوگوں سے جان پہچان ہے آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی..... کہ کوئی تو کالج کا ساتھی یہاں رہتا ہے۔''

ستارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ اوپر کے بنگلے میں پہنچ گئی۔ وہ لڑکا جس کا نام شاہد تھا..... حیران سا اپنے گھر پہنچ گیا۔

اُسے وہ بہت بھلی لگی تھی..... آج تک اتنا دلکش چہرہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دی تھیں اور پھولوں سے گھیری ہوئی جھیلوں کی مانند تھیں۔ رنگ روپ تازہ اور نکھرا ہوا تھا۔ وہ آج تک کسی پر فریفتہ نہیں ہوا تھا۔

وہ جواب دیئے بغیر ہی اوپر کی طرف چل دی۔ وہ مجھے جانتی تک نہیں تھی۔ پھر جواب کیا دیتی۔ شاہد اس کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ ماں نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑا۔ اندر آؤ کھانا لگا دیا ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

شام کے وقت وہ پھر ٹیرس پر آیا تو آبشار کے اردگرد لوگ بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کی نگاہ بے اختیار اوپر کی طرف اُٹھ گئی۔ تو وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی آبشار کی جانب آ رہی تھی۔ وہ جھوم اُٹھا اور گھر سے باہر نکل کر آبشار تک پہنچ گیا۔ وہ خراماں خراماں قدم اُٹھاتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ میں پہنچ گئی۔ سب کھڑی ہو کر اس سے ملنے لگیں۔ نادیہ نے کہا۔

تم اوپر بلا رہی تھی۔ مگر دیکھو یہاں نظارہ کتنا دلفریب ہے۔ اچھا بابا۔ ٹھیک ہے۔ مگر امی نے تو چائے کا بندوبست کیا ہوا ہے۔

فوزی نے جواب دیا۔

''وہ بھی پی لینگے..... آخر آنٹی نے اس دلفریب موسم میں پکوڑے بنائے ہونگے۔''

''واہ''

ستارہ مسکرا دی۔

''واقعی آنٹی نے پکوڑے بنائے ہیں''

''تو فضلو سے کہو یہاں ہی لے آئے''

''ارے نہیں..... آنٹی سے ملیں گے اور پکوڑے بھی کھائیں گے۔'' سعدیہ نے ستارہ سے پوچھا۔

ستارہ اس ویرانے میں دل لگ جاتا ہے۔ توبہ بہت ہی سنسان جگہ ہے۔ مجھے تو رونق والی جگہیں پسند ہیں۔

''لیکن مجھے تو اس ویرانے میں بہت لطف آتا ہے۔ پڑھائی میں دل بھی لگتا ہے۔''

سعدیہ نے کچھ دور شاہد کو گھاس پر بیٹھے دیکھا اور ستارہ سے کہا۔
یہ تو تین روز سے کالج میں دکھائی دے رہا ہے۔ نہ جانے اکیلے بیٹھے کس کا انتظار کر رہا ہے۔
"یہ بھی دائیں جانب بنگلوں میں سے ایک میں رہتا ہے۔"
"واہ..... ستارہ..... اتنی جلدی میل ملاقات ہوگئی۔"
"نہیں جب میں کالج سے واپس آئی تو یہ اوپر جاتے جاتے بتا رہا تھا۔" نادیہ نے ستارہ سے کہا۔
"کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔"
فوزی نے ہنس کر جواب دیا۔
"دیکھنے دو..... ہمارا کیا لیتا ہے۔"
ضرور کسی لڑکی کے انتظار میں ہوگا۔ لگتا تو بڑا معصوم ہے۔
ستارہ نے کہا۔
چھوڑو بھی اس قصے کو اوپر چل کر چائے پیتے ہیں۔ وہ سب کو لے کر اوپر کی طرف چلی اور اس کی جانب دیکھا تو بھی کھڑا ہوگیا۔
نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ستارہ یوں لگتا ہے۔ تمھارے لیے یہاں آیا ہے۔" بکواس نہ کرو۔ میں نے تو آج ہی اسے دیکھا ہے۔ یوں باتیں کرتیں وہ سب گھر پہنچ گئیں۔ پکوڑوں کی خوشبو چار سو پھیلی تھی۔ اور میز پر پہنچ کر پکوڑوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور سب اس لڑکے کو بھول ہی گئیں۔
اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔ جوں ہی صبح کے وقت وہ کالج کے لیے نکلتی تو وہ اپنی بائیک پر بیٹھ کر کالج تک پہنچتا۔ شاہد کا بہت جی کرتا کہ وہ باتیں کرے، ہنسے مسکرائے اور پھر ملاقات دوستی میں بدل جائے۔ لیکن نہ جانے کیوں ستارہ اس کے قریب سے خاموشی سے گزر جاتی۔ اور وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ ماں سے اسے معلوم ہوگیا کہ اس بنگلے میں ماں بیٹی رہتی ہیں۔ باپ باہر کے ملک میں رہتا ہے اور کبھی کبھی پاکستان آتا ہے۔
شاہد نے دل میں سوچا..... پھر تو اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لڑکی نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ میں ماں سے ضرور بات کروں گا۔ انہی سوچوں میں گم تھا۔ کہ اس کی بہن کرن نے اس سے کہا۔
شاہد بھائی آج شام کو میں نے ریسٹورنٹ جانا ہے۔ اس ویرانے میں تو بہت بور ہوگئی ہوں۔ امی کو صبح سے کہہ رہی ہوں تو وہ کہتی ہیں جب میں پہاڑی سے اترتی ہوں تو میرے گھٹنے میں درد شروع ہو جاتی ہے۔ آج میری سب سہیلیاں وہاں آرہی ہیں۔
شاہد نے جواب دیا۔
اچھا میں لے جاؤں گا۔ اور واقعی شام کے وقت وہ موٹر بائیک پر مال روڈ پہنچ گیا۔ وہاں کرن کی سہیلیاں پہنچ چکی تھیں۔ شاہد نے دائیں جانب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ستارہ۔ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ شاہد کے قدم وہاں جم سے گئے۔ فطرت کی نہایت ہی حسین تصویر اس کے سامنے تھی۔

''بھائی۔''

کرن نے پکارا۔ ویٹر نے ہمارے لیے جگہ بنالی ہے۔ وہ جب اپنی سیٹ پر بیٹھا تو ستارہ کی کرسی بالکل اس کے قریب تھا۔ پھر کرن نے بھائی سے کہا۔

میری سب سہیلیاں دوسری میز پر بیٹھی ہیں۔ میں وہاں جا رہی ہوں آپ یہیں پر بیٹھے رہیں۔ کرن جا چکی تھی اور شاہد کو موقع مل گیا۔ ستارہ کو دیکھنے کا۔ وہ کسی بات پر ہنستی تو شاہد کو یوں گمان ہوتا جیسے کسی جھرنے سے آواز اُبھر رہی ہے۔

سب سہیلیاں کھا پی رہی تھیں۔ فوزی نے برابر کی میز پر دیکھا تو شاہد کو دیکھ کر ستارہ سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔

''ستارہ اب تو اس نے پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ کتنی للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔'' ہمارے لیے تھوڑی آیا ہے وہ اپنی بہن کو لے کر آیا ہے شاید اس کی سہیلیاں بھی یہاں موجود ہیں۔

سعدیہ نے مسکرا کر کہا۔

واہ اس کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔

سب ہنس پڑیں تو شاہد کا دل اچھل پڑا۔

باہر گہرے بادل چھائے تھے فضاؤں میں خنکی رچی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اور ہوائیں تیز سے تیز ہو رہی تھیں۔ درختوں کے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چائے کے اختتام میں ساری لڑکیاں جانے لگیں۔

کرن نے شاہد سے کہا۔

اس بارش میں کیسے جائیں گے۔ وہ پریشان سی بارش کو برستا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں بند ہو جائے گی اور ہمیں یہاں کچھ دیر رکنا پڑے گا۔ شاہد نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

سب لڑکیاں باری باری چلی گئیں اور کرن بائیک پر آئی تھی۔ بے بسی سے باہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر ستارہ نے کرن سے کہا۔

''اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو آسکتی ہو۔''

''جی..... بہت شکریہ''۔ پھر شاہد کی جانب دیکھا۔

''تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں بارش رکنے کا انتظار کروں گا۔'' ستارہ کرن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بارش قدرے تھم گئی تھی مگر فضلو نے ڈگی سے چھاتا نکالا اور ستارہ کے حوالے کیا۔ اور وہ دونوں ہی چھاتے سے پناہ لیتی ہوئیں اوپر پہنچ گئیں۔

''بہت شکریہ۔ آپ آئیں ہمارے گھر۔''

امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ پھر کسی دن۔ یہ

کہہ کر پھر وہ اوپر کی جانب پہاڑی عبور کرنے لگی۔
ستارہ قدم بڑھاتے ہوئے گھر کی جانب چل دی۔ بارش تھم گئی تو شاہد بائیک پر بیٹھا منصوبے بنانے لگا۔ اب تو راہ رسم بڑھ جائے گی۔ شاید یہ بھی مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ میں ماں کو منالوں گا اور شادی اسی سے کروں گا، اس کے علاوہ کسی سے نہیں کروں گا۔ نہ جانے اتنے عرصے میں مجھے کوئی لڑکی پسند کیوں نہیں آئی نہ جانے اس لڑکی میں۔
شاہد یہ سوچتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔
شاہد کالج سے گھر آیا ہی تھا اس کی ماں نے بتایا۔ آج اوپر والے گھر میں کوئی تقریب ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناطے مجھے اور کرن کو بلایا ہے۔ تم بھی جا سکتے ہو۔ چلو گے۔
شاہد کا دل اچھل پڑا۔
"ضرور...... ضرور آخر پڑوسی ہیں۔" اور وہ مکمل طور پر اس کے خیالوں میں کھو گیا۔
شام کو شاہد کی سج دھج نرالی تھی۔ پاؤں بے قابو ہو گئے۔
وہاں پہنچ کر ستارہ کو دیدہ زیب لباس میں دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ کالے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ خوبصورت آنکھیں، پیاری ہونٹ اور پھول کی پنکھڑیوں کی طرح گال۔ اس کے قریب سے جب گزری تو شاہد کو یوں محسوس ہوا آسمان کا روشن ستارہ زمین پر آ گیا ہو۔ دم بخود رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ کیسا احساس ہے جو مجھے اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ ایک بھرپور کشش نے اس کے پاؤں جکڑ لیے تھے۔
ستارہ کی والدہ نے کہا۔
آؤ بہن...... آپ کا ہی انتظار تھا۔ سب مہمان پہنچ گئے ہیں۔ ستارہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس کی والدہ نوجوان کے قریب بٹھاتے ہوئے گویا ہوئیں۔
ستارہ کے والد جب کل باہر سے واپس آئے تو آتے ہی ستارہ کی منگنی کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ بات تو بچپن میں یہ طے تھی۔ منگنی کر کے رشتے کو مضبوط کر دیا ہے۔ امتحان کے بعد اس کی شادی کر دوں گی۔
شاہد کی آنکھوں میں جو ستارے جھلملا رہے تھے۔ خوشی میں اپنے آپ کو فضاؤں میں اڑتا۔ محسوس کر رہا تھا۔ دھڑام سے نیچے گرا۔ وہ تو جیسے آسمان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سحر اور دلفریب جادو تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر باہر آیا۔ تو ساری فضا اداس تھی۔ سارے منصوبے ریت کی مانند پاؤں سے پھسلتے گئے اور آنکھوں میں سیلاب آ گیا۔ ساری کائنات اداس دکھائی دی۔ نہ جانے ڈگمگاتے قدموں سے کس طرح گھر کے دروازے تک پہنچا۔ تو اسے یوں لگا جیسے کائنات کا ہر دروازہ اُس پر بند ہو گیا ہو۔

☆☆☆☆☆

خواب اور حقیقت

''خواب پراگندہ یا منتشر خیالات کی وجہ سے آتے ہیں''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ تبخیر معدہ، ذہنی پراگندگی یا منتشر خیالی کیوجہ سے نیند کی حالت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں''

''وہ خواب جنھیں سچے خواب کہا جاتا ہے ان کی کیا حقیقت ہے؟''

''کوئی سچے خواب نہیں ہوتے۔ البتہ بعض خواب سمبالک Symbolic ضرور ہوتے ہیں۔''

''سمبالک خواب کون سے ہوتے ہیں؟''

''وہ خواب جن کی کوئی توجیح کی جاسکے، جن کی کسی صورت Interpretation ہوسکے۔''

''پرانے لوگ خرابوں کی تعبیریں بھی بیان کرتے ہیں۔''

''یہ سب چیزیں فقیروں اور عاملوں اور نجومیوں کا ڈھکوسلہ ہے۔''

''اور جو خواب پیغمبروں اور ولیوں نے دیکھے یا جن خوابوں کی تعبیر انھوں نے بیان کی۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کا مصر کے قید خانے میں خوابوں کی تعبیر بیان کرنا۔ دو خوابوں کی تعبیر جو قیدیوں نے دیکھے تھے اور تیسرا خواب جو مصر کے حکمران نے دیکھا تھا اور اسی خواب کی تعبیر بیان کرنے پر حضرت یوسفؑ کو نہ صرف زندان سے باہر نکالا گیا بلکہ سات سالہ قحط کے دوران ذخیرہ شدہ اناج کی تقسیم کا اختیار بھی سونپا گیا۔

''پیغمبروں کے معاملات پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''اسی طرح بعض خواب ڈراؤنے اور بعض سہانے ہوتے ہیں۔''

''ان کا تعلق ہماری ذہنی کیفیات سے ہوتا ہے۔ ہمارے اندر کا ڈر یا ہماری ناقابل حصول خواہشات ڈراؤنے اور سہانے خوابوں کی وجہ بنتے ہیں۔ دراصل جب ہمارا شعور سو رہا ہوتا ہے تو تحت الشعور میں جمع خیالات ابھر کر خواب بن جاتے ہیں۔''

''مجھے لڑکپن میں ایک خواب آیا تھا جسے میں گزشتہ برسوں میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔

پیروز بخت قاضی

اس کا مطلب ہو سکتا ہے؟ اس خواب کی ضرور کوئی اہمیت ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کیا اہمیت ہے۔''

''کیا خاص بات ہے تمھارے خواب میں؟''

''بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی لیکن ہے ضرور اس کے پیچھے کوئی خاص بات۔''

''اپنا خواب بیان کرو۔''

''کئی برس پہلے جب میں سکول کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو میں نے پہلی بار یہ خواب دیکھا تھا۔ ایک تنگ سی گلی ہے جس میں اینٹوں کا فرش لگا ہے۔ ایسی گلیاں ہمارے اکثر قصبوں اور محلوں میں پائی جاتی ہیں۔ میں اس گلی میں پیدل جا رہا ہوں۔ چند قدموں کی مسافت کے بعد اچانک گلی کشادہ ہو جاتی ہے اور میدان کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس کے دونوں طرف یک منزلہ مکانات ہیں۔ میدان کے اس کشادہ حصہ کے آگے راستہ پھر گلی کی صورت میں باہر نکل جاتا ہے۔ جب میں گلی سے گزر کر کشادہ حصہ میں پہنچتا ہوں تو دائیں جانب والے مکانوں میں سے ایک مکان کے صدر دروازے پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا ہے، جس پر رنگا رنگی افقی لکیروں کا ڈیزائن بنا ہے۔ اچانک مخروطی انگلیوں والا ہاتھ اندر کی جانب سے پردے کو ایک طرف ہٹاتا ہے اور وہاں ایک چاند جیسا نسوانی چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکی کا چہرہ...... گورا رنگ، متوازن نقوش اور چہرے پر سنجیدگی اور بشاشت کا ملا جلا تاثر۔ میں چہرہ دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہوں اور ساتھ ہی خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ جاگنے پر میں نے اپنی طبیعت پر اس خواب کا ایک خوشگوار تاثر محسوس کیا۔''

''اس خواب میں بھلا کون سی خاص بات ہے۔''

''پہلی بار دیکھ کر میں نے بھی یہی سمجھا تھا لیکن خواب کے خوشگوار تاثر نے اس منظر کا گہرا نقش میرے ذہن پر چھوڑا تھا۔''

''بس کوئی دیکھا بھالا منظر، کوئی جانا پہچانا حسین چہرہ خواب میں آ گیا ہوگا۔''

''یہی تو بات ہے نہ میں نے وہ منظر کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی وہ چہرہ۔ نہ ہی کھلے میدان والی اس قسم کی گلی دیکھی تھی اور نہ ہی افقی لکیروں والا رنگا رنگ پردہ۔''

''پھر؟''

''پھر کیا۔ میں نے کئی بار اسے خیال سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش کی لیکن یہ خواب اپنی پوری تفصیل کے ساتھ میں کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں۔ خواب دیکھ کر اُٹھتا ہوں تو ہمیشہ طبیعت پر اس کا ایک خوشگوار تاثر محسوس کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت کے روپ میں وہ منظر، وہ گلی، وہ پردہ، وہ چہرہ، وہ مخروطی انگلیاں دیکھنے کی خواہش اختیار کر لیتی ہے۔''

جمیل نیا نیا لیکچرار بن کر اس کالج میں آیا تھا۔ یہ کالج اور شہر دونوں اس کے لیے نئے تھے۔ وہ کالج کے قریب ہی ایک مکان میں اپنی والدہ کے ہمراہ رہنے لگا تھا۔ منظور تین چار برس سے اس کالج میں پڑھا رہا تھا۔ اس سے قبل وہ کسی دوسرے شہر میں تعینات تھا۔ اس کالج میں تعیناتی کے بعد وہ اپنی چھوٹی بہن کے ہمراہ

اس مکان میں مقیم تھا، جو اس کی بیوی کو وراثت میں ملا تھا۔ جمیل اور منظور دونوں کے ایک ہی وقت پر خالی پیریڈ ہوتے اور وہ سٹاف روم میں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے تھے۔ تھوڑے عرصہ میں ان کے دوستانہ مراسم بن چکے تھے۔ وہ دونوں کالج کے سٹاف روم میں بیٹھ کر دیر تک ''خواب اور حقیقت'' کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے لیکن ان کی گفتگو نا تمام رہ گئی تھی۔ اس شام جمیل کو منظور نے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا تھا۔ جمیل کالج سے رخصت ہوتے وقت دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ شام کو جب وہ منظور کے گھر جائے گا تو اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ بعض خواب بڑی اہمت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض بالکل سچے خواب ہوتے ہیں۔

شام چھ بجے جمیل نے محلہ دریا آباد کا رخ کیا۔ جب وہ بڑی سڑک پر دوسرے چوک سے بائیں جانب مڑا تو اسے لگا جیسے وہ پہلے بھی وہاں آچکا ہے لیکن وہ تو جب سے اس شہر میں وارد ہوا تھا کبھی بھی اس محلہ میں نہیں آیا تھا۔ اس تنگ سی گلی میں اینٹوں کا فرش لگا تھا۔ وہ پیدل ہی جا رہا تھا چند قدم آگے جا کر اچانک گلی کشادہ ہو گئی تھی اور ایک میدان کی صورت اختیار کر گئی تھی جس کے دونوں طرف کئی منزلہ مکانات تھے۔ میدان کے اس کشادہ حصہ کے آگے پھر راستہ گلی کی صورت میں باہر نکل جاتا تھا جمیل نے دائیں طرف نظر دوڑائی تو ایک مکان کے صدر دروازے پر کپڑے کا پردہ لٹکا دیکھا جس پر رنگا رنگ افقی لکیروں کا ڈیزائن بنا تھا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو پر زور سے چٹکی لی تا کہ جان سکے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ چٹکی کا درد محسوس کرتے ہی اس نے دیکھا کہ مخروطی انگلیوں والے ہاتھ نے اندر کی جانب سے پردے کو ایک طرف ہٹایا اور وہاں ایک چاند سا نسوانی چہرہ نمودار ہوا۔ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکی کا چہرہ۔ گورا رنگ، متوازن نقش اور چہرے پر سنجیدگی اور بشاشت کا ملا جلا تاثر۔ جمیل نے طبیعت پر ایک خوشگوار تاثر محسوس کیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر لڑکی سے پوچھا ''پروفیسر منظور صاحب کا گھر کون سا ہے؟'' جواب ملا ''یہی ہے۔ میں انہیں بھیجتی ہوں'' اور چہرہ پردے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ منظور نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور جمیل کو اندر لے جا کر بٹھایا۔ جمیل نے ''خواب اور حقیقت'' کے موضوع پر کوئی بات نہ چھیڑی۔ بس چائے کی پیالی پر گپ شپ ہوتی رہی اور کچھ نئی کتابوں کا ذکر ہوتا رہا۔

جمیل نے رخصت سے قبل منظور کو بتایا کہ اس کی امّی گھر میں اکیلی ہوتی ہیں، اس لیے وہ دیر تک گھر سے باہر نہیں رہتا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی امّی کو لے کر کسی روز آپ کے گھر آؤں۔''

''ضرور لائیں۔ میری بیگم اور چھوٹی بہن ان سے مل کر خوش ہوں گی۔''

☆☆☆☆☆

قطار ٹوٹتی ہے

حاجی گل جیسے ہی بس سے نیچے اترا اس کے سامنے سرکاری پانی کا بڑا سا سائن بورڈ تھا۔ جس پر تیر کا نشان پانی کے ذخیرے کی طرف رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا ایک چھوٹا سا سرکاری دفتر نظر آیا جسکے سامنے والے دروازے پر ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ لوگوں کے مشورے اور تاکید کے مطابق حاجی گل صبح سویرے منزل پہ پہنچ چکا تھا اسے بہت خوشی ہوئی ہے کہ بھیڑ اور لمبی قطار کی تکلیف سے بچ گیا لیکن چوکیدار نے جھڑکتے ہوئے کہا ابھی تو سرکاری عملہ بھی نہیں پہنچا اور تم آن ٹپکے لگتا ہے تم بہت ہی زیادہ جلد باز اور بے صبرے ہو حاجی گل چوکیدار کی نظروں میں جھانکتا ہوا شرمندگی اور رازداری سے بولا اصل میں میرا کوئی ہے نہیں۔ مجھے قطار میں لگ کر خود ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا میری بیوی کے اعصاب کمزور ہو چکے ہیں بینائی سماعت اور زبان کے ذائقہ مٹتے جا رہے ہیں۔ میں اس کو حتی الوسع زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میری دُعا ہے کہ وہ میرے ہوتے ہوئے اپنا آخری سانس سکھ سے لے کے مرے۔ تاکہ میں اُسے محبت سے مٹی کے سپرد کر سکوں۔ مجھے پانی کی بے حد ضرورت ہے۔ اپنے لیے بھی اور اسکے لیے بھی۔ ویسے میں اُس کے بعد مرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی بیماری آ لگی۔ تو شاید میں یہاں آنے کی تکلیف بھی نہ کر پاؤں۔ شاید میں سب سے پہلے آنے والا ضرورت مند ہوں''۔ حاجی گل نے دوستی اور ہمدردی کی اُمید میں مسکراتے ہوئے چوکیدار کو اپنا ہم خیال سمجھتے ہوئے کہا۔ لیکن چوکیدار پہ اسکی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ سختی سے بولا تم یہ دفتر کے پیچھے قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ لہجے میں تمسخر بھرتے ہوئے بولا آگے تم سے پہلے وہ لوگ کھڑے ہیں جو تین دن پہلے آ چکے تھے۔ لوگ اپنے بھائی، بیٹوں کو ساتھ لے آتے ہیں۔ تاکہ وہ

کلیم خارجی

قطار میں کھڑے ہو کر آگے کھسکتے رہیں شفا کا سرکاری پانی اتنی آسانی سے نہیں ملتا" یہ کام تو مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ میری جگہ قطار میں کون کھڑے ہو کر انتظار کے تکلیف دہ مرحلے سے گزرے گا۔ حاجی گل نے ڈوبتے ہوئے کہا۔ بس قطار میں لگ جاؤ۔ چوکیدار ہدایت دیتے ہوئے بولا آٹھ بجے تک تم ایک اور مین گیٹ پہ جاؤ گے۔ جہاں پیسے ادا کر کے تم ایک ٹوکن اور پانی کی خالی بوتل خرید پاؤ گے۔ بوتل لے کر پھر تم آہستہ آہستہ پانی کے پلانٹ کی طرف جاؤ گے اور اگلی صبح تک تم پانی حاصل کر سکو گے۔ چوکیدار برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کے حاجی گل کے قریب آیا، تو حاجی گل کو اس پر شدید غصہ آنے لگا اور وہ کوشش کے باوجود غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا، تم یقیناً ان لوگوں میں سب سے نچلے درجے پر ہو گے جو شفا کے پانی پر قبضہ کر کے لوگوں کو محروم اور پیاسا رکھ کے اپنا منافع حاصل کرنے والے ہیں۔ تم مجھے روکنے اور تکلیف دینے میں بہت ہی نیچے تک گر سکتے ہو۔

چوکیدار کوئی مزاحمت کیے بغیر برآمد کی سیڑھیاں چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ تا کہ اپنی اور حاجی گل کی حیثیت واضح کر سکے۔ حاجی گل آج اپنے دل و دماغ میں عجیب تجربے سے گزر رہا تھا اس نے نہ تو کسی سرکاری اہلکار سے اس لہجے میں بات کی تھی اور نہ ہی آج تک اُس نے اتنے اعتماد کے ساتھ گھونسے والی دھمکی استعمال کی تھی۔ اس نے اپنا لمبے چوڑے ہاتھ کی انگلیاں موڑ کر کس کر گھونسہ بنایا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر چوکیدار کی طرف گھونسہ لہراتے ہوئے بولا۔ میں نے آج تک صرف اور صرف اس گھونسے کی طاقت پر زندگی گزاری ہے۔ تمہیں تجربہ کر کے دیکھنا پڑے گا کہ میرے گھونسے میں کتنی طاقت ہے بغیر گھونسے کے تم جیسے لوگوں کے درمیان زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ کاش تم ان لوگوں کو دیکھ پاتے جو میرے گھونسے کا شکار ہو چکے ہیں۔

چوکیدار پہ حاجی گل کی باتوں کا اثر ہونے لگا۔ وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ تم جس مقصد کیلئے آئے ہو اس پر توجہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری بیوی تمہارے گھونسے کی قوت دیکھے بغیر ہی چل بسے۔ لگتا ہے تم کوئی پیشہ ور باکسر ہو۔ چلو جاؤ آگے قطار ہے۔ میں تمہاری کوئی خاص مدد نہیں کر سکتا۔ آخری بات ادا کرتے ہوئے چوکیدار کے لہجے سے حاجی گل کا اعتماد یکدم بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ فتح مندی اور طاقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے بند مٹھی سے اپنا ماتھا ٹھوکنا شروع کر دیا پھر یکا یک اسکی آنکھیں بھیگنے لگی۔ کوئی اس کے اندر سے اُسے کہے جا رہا تھا کہ تم نے ساری زندگی شرافت، بزدلی اور نیک ہونے کے مظاہرے میں گزار دی، تم نے اپنے گھونسے کی طاقت پہلے کیوں نہ استعمال کی۔ تم جن مشکلوں اور مصیبتوں سے گزر رہے ہو اگر تم اس طرح

رہتے تو شاید آج حالات کچھ اور ہوتے۔ تم نے اپنا گھونسہ بھی آج پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا خود کو ملامت کرتا ہوا وہ قطار میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے آگے بیس پچیس افراد قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اپنے اندر کی ملامت اور جرأت سے اس نے ایسی قوت اور اعتماد محسوس کیا کہ وہ قطار میں کھڑے ہونے کی کوفت اور انتظار کی اذیت سے آزاد ہو گیا۔ وہ اپنے نئے تجربے کی خوشی میں کھویا ہوا تھا کہ اس کے آگے والے آدمی نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لگتا ہے آج قطار لمبی نہیں ہوگی۔ ہمیں جلدی سرکاری پانی مل جائے گا۔ قطار کے آگے سے ایک آواز آئی یہ تمہاری خوش فہمی ہے حضرت۔

ہم تو ٹوکن لے کر خالی بوتل خریدنے والے لوگ ہیں اور وہ جو ٹوکن اور بوتلیں حاصل کر چکے ہیں ان کی قطار آگے لگی ہوئی ہیں۔ صرف کھوپڑیاں نظر آرہی ہیں تم ذرا ٹوکن اور برتن خرید لو۔ پھر دیکھنا۔ ''بھولا ہے۔ دل کو تسلیاں دے رہا ہے'' ایک اور آواز آئی ابھی اس کے پیچھے بھی قطار لمبی ہونے والے ہے۔ ''کوئی بات نہیں اصل مسئلہ تو قطار میں کھڑا ہونا تھا۔ اُمید ہے باری آجائے گی'' حاجی گل نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔ آگے والے آدمی نے منہ موڑ کر اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا لگتا ہے تم بھی پیسے لے کر کسی اور کے لیے یہاں آ کھڑے ہو۔ جبھی تو بے غم نظر آرہے ہو۔۔۔ تمہیں کتنا وقت لگے گا۔ تمہیں پرواہ نہیں ہے۔

''مجھے بہت پرواہ ہے یار۔ میری بوڑھی بیوی۔ موت کے انتظار کرتی رہتی ہے اسکی بیماریاں بڑھ گئیں ہے بہت علاج کروا لیا کسی نے کہا یہ سرکاری پانی شفا سے بھرپور ہے اس کے پیتے ہی طاقت اور مدافعت بڑھ جاتی ہے۔ کیا واقعی اس پانی میں ہر مرض کے لیے شفا ہے۔

آگے والے نے ہمدردی اور خلوص سے حاجی گل کو دیکھا۔ اور پوچھا آپ شاید پہلی مرتبہ آئے ہیں پھر حاجی گل کا جواب سنے بغیر بولا میں تو اپنے بڑے بھائی کی جگہ یہاں کھڑا ہوں۔ وہ کل کھڑے کھڑے کھسکتے ہوئے تھک گیا تھا۔ سوچا اسکی جگہ گھیر لوں۔ وہ کل اٹھارہ گھنٹے تک کھڑا رہا تھا۔ آج دس بجے تک وہ واپس آجائے گا تو میں اس کی یہ جگہ اسکے حوالے کردوں گا۔ اپنے سامنے کھڑے آدمی کی پیٹھ کی گرمی محسوس کرنے کے باوجود حاجی گل کو وہ بہت اچھا لگا کیونکہ اسکی باتوں میں دوستی کا جذبہ اور اخلاص تھا اگر تمہارا بھائی واپس نہ آیا۔ تو تم اسکی جگہ پانی حاصل کر سکو گے ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابھی تو میں نے ٹوکن اور بوتل خریدنی ہے جسکے پاس یہ ٹوکن اور سرکاری بوتل ہو وہ پانی لے سکتا ہے میں یہ دونوں چیزیں لے کر آگے بڑھتا رہوں گا۔ میرا بھائی آئے گا تو میں اسکے حوالے کردوں گا۔ اسطرح قطار میں لگے دوسرے لوگوں کو برا بھی نہیں لگتا۔ اور قطار بھی نہیں ٹوٹتی۔

یہ تو بہت اچھا نظام ہے کوئی جھگڑا فساد نہیں

ہوتا۔ حاجی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
جھگڑا فساد ہو تو سرکار کو ہی فائدہ ہوتا ہے آدمی شرارت سے بولا جو لوگ کرایے لے کر دوسروں کی جگہوں پہ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بغلوں میں بوتلیں چھپا کر لاتے ہیں اور محافظوں اور چوکیداروں سے ملی بھگت کر کے بوتلوں میں پانی لے جاتے ہیں بہت سے لوگوں کا تو ہی روزگار ہے۔ کھڑے ہو کر دیہاڑی بھی لگاتے ہیں اور چوری کا پانی لے جا کر فروخت بھی کر دیتے ہیں۔
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کی چوری وغیرہ ہوتی ہے۔ حاجی گل نے تفتیشی انداز اپناتے ہوئے پوچھا۔ ہاں بھئی چوری ہوتی ہے چوری، چکاری، دھوکہ فریب تو ہم اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں پکڑے جانے پہ مٹھیاں گرم ہوتی ہیں اور پانی بکتا رہتا ہے۔ آگے والے آدمی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے حاجی گل سے پوچھا، صاحب آپ کیا کام کرتے ہیں حاجی گل اسی سوال کے انتظار میں تھا۔ روانی اور اعتماد سے بولا، ''میں پیسے لیکر گھونسوں کی لڑائی لڑتا ہوں۔ گھونسے باز یعنی باکسر ہوں۔ گھونسے مارنا اور گھونسوں سے خود بچنا میرا پیشہ ہے۔ جب تک میں تین چار آدمیوں کو ادھ موا نہ کر دوں۔ میرے ہاتھ کانپتے رہتے ہیں۔ دل تڑپ رہا ہے کہ دو تین آدمیوں کو گھونسے دے ماروں اور پھر اُنہیں شفا کا پانی پلا دوں یوں پانی کی تاثیر کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔'' حاجی گل نے اتنے زور سے یہ باتیں کیں۔ کہ اس کے پیچھے کھڑا ہوا موٹا بھدا آدمی جسکی بدبودار سانسوں نے حاجی گل کا دماغ خراب کر ڈالا تھا۔ ڈر کے پیچھے کی طرف کھسک گیا۔ اس کے آگے والا بھی ذرا آگے سرک گیا تا کہ حاجی گل آسانی سے کھل کر کھڑا ہو سکے۔ قطار میں دُور تک سرگوشیاں ہونے لگیں حاجی گل کی انگلیاں شرارت اور طاقت سے پھڑکنے لگیں۔
ٹوکن والے چھوٹے سے چوکور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں باوردی اہلکار پانی کی مقدار کے لحاظ سے رقم وصول کر کے ٹوکن اور پلاسٹک کی بوتل دینے پر مامور تھا۔ حاجی گل نے کھڑکی میں سے اپنا بڑا ہاتھ سے اندر داخل کر کے پیسے دیئے۔ اور بوتل لیتے ہی اس نے اتنے زور سے بھینچی کہ وہ پچک گئی اہلکار پہلے تو پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہ گیا پھر جھڑکتے ہوئے بولا۔ اگر بوتل پر سے لیبل اُتر گیا تو پانی نہیں لے سکو گے۔ ہوش کرو۔۔۔
حاجی گل کو اہلکار کی کیفیت دیکھ کر بڑا لطف آیا اور وہ ٹوکن وصول کرتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔ اتنا پیسہ کمار ہے ہو اور وہ بھی پانی بیچ کر۔ شرم کرو بوتلیں تو اچھی کوالٹی کی بناؤ۔ پانی کے تاجرو۔
قطار میں کھڑے کچھ لوگوں نے خوشامد اور بزدلی سے جب حاجی گل کو اپنا رویہ نرم رکھنے کی درخواست کی تو اہلکار دبک کر کسی پر

بیٹھ گیا۔ اور لہجہ بدلتے ہوئے بولا آگے بڑھو تا کہ پیچھے والے کی باری آئے میری تمہاری کوئی دشمنی تو نہیں۔ آگے بڑھو۔ قطار میں سے ایک آدمی نے بلبلا کر بولا۔ باکسر بھائی۔ گھونسے والے سرکار۔ آگے بڑھ جائیں ہماری ٹانگیں دکھنے لگیں ہیں۔

حاجی گل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بے ہمت اور سسکتے ہوئے چہروں کی ایک طویل لائن کھڑی تھی۔ چنانچہ وہ سنبھلتے ہوئے آگے بڑھ گیا دوسرا بڑا دروازہ ذرا کم فاصلے پہ تھا وہاں تک پہنچتے پہنچتے حاجی گل نے کئی قسم کی سرگوشیاں سنیں۔ کئی لوگ اسکے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں کو دلچسپی سے گھورنے لگے۔ ایک ہلکی سی آواز ابھری۔ واہ بھئی کیا مضبوط اور لمبے چوڑے ہاتھ ہیں۔ ان کی چوٹ تو یقیناً لوہے کے ہتھوڑے جیسے ہوگی۔ ایک آدمی اور بولا بھئی طاقتور ہونے کے باوجود باکسر شریف اور صبر کرنے والا ہے۔ بس ایک سرگوشی ایسی تھی جس نے حاجی گل کے خون میں حرارت اور مستی بھر دی۔ کسی نے قدرے زور سے کہا تھا ایسا مضبوط اور طاقتور گھونسے والا آدمی قطار میں کیوں لگا ہے۔ اسے تو سب کچھ ایک پل میں مل سکتا ہے یہ محافظ وغیرہ سب کا غذی شیر ہیں۔

دوسرے دروازے کے اندر پاؤں رکھتے ہی حاجی گل کی قطار ان لوگوں سے جڑ گئی ہے جو ٹوکن اور بوتلیں لے کر پانی کے ایک بہت بڑے اور گول ٹینکر کی جانب بڑھ رہے تھے زمین پہ نصب پیلے رنگ کا بہت بڑا ٹینکر آسمان سے گرے ہوا کوئی سیارہ نظر آرہا تھا حاجی گل سامنے والے منظر میں کھو گیا تھا ذرا سے فاصلے پر دو گول اور سفید ٹینکر تھے اسکے آگے تین نیلے رنگ کے ٹینکر تھے۔

حاجی گل کو پتہ چلا کہ رنگوں کے اعتبار سے غبارہ نما ٹینکر ضرورت مند کی درجہ بندی کیلئے مخصوص کیے گئے تھے نیلے رنگ کے ٹینکروں کے قریب سرکاری گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں شیشوں کی گھڑا نما بوتلیں بھر بھر کے رکھی جارہی تھیں۔ سفید ٹینکر اعلیٰ افسران اور بااختیار لوگوں کے خاندان کیلئے وقف تھی۔ نیلے اور سفید ٹینکروں کے سامنے کوئی قطار تھی نہ کوئی نگران۔ اور ان سے پانی حاصل کرنے والوں کیلئے نہ مخصوص وقت نہ ضابطہ۔ پیلے ٹینکر کے جانب بڑھنے والی قطار میں لوگوں کی بے چینی بڑھی تو پتہ چلا کہ سفید اور نیلے ٹینکروں میں پانی کی مقدار اور بہاؤ کو تیز کرنے کیلئے اکثر پیلے والے ٹینکر سے پانی کی فراہمی روک دی جاتی ہے۔

حاجی گل اپنے مکے کس کر احتجاج کرنے لگا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے آگے کھڑے ہوئے آدمی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔ ''صبر کرو اب تو پانی حاصل کرنیوالے ہیں۔ یہ ہم سے دس بارہ آدمیوں کے آگے جو گھنی داڑھی اور سفید کپڑوں میں جو آدمی ہے۔ یہ اپنے بیمار بیٹے کے لیے پانی لینے آیا تھا لیکن اسکا بیٹا بیماری

میں مر گیا - پہلے تو میں کھڑے کھڑے روتا رہا- پھر اپنے بیٹے کی میت کو دفنانے کیلئے جانے لگا تو اپنی جگہ دوسرا آدمی کھڑا کر گیا تھا- بیٹے کو دفنانے کے بعد یہ دوبارہ اپنی جگہ آن کھڑا ہوا ہے- لوگوں نے طعنہ دیا تھا کہ اب کیا کرو گے پانی لیکر وہ لوگوں سے جھگڑا پڑا تو اور چیخنے لگا تھا کہ وہ اپنی جگہ کسی اور کیلئے کیوں چھوڑے-

''بات تو کسی حد تک دُرست ہے-'' حاجی گل سے آگے تیسرا آدمی پہلی مرتبہ بولا- کسی اور کیلئے کام آجائے گا- گھر کے باقی افراد کیلئے ضرورت پڑ سکتی ہے - یہاں قطار میں کوئی کسی کو اپنی جگہ پہ پانی حاصل کرنے کی رعایت نہیں دیتا- سب ایک دوسرے کو آگے کی جانب دھکا دیتے ہیں- اور ایک دوسرے کو اپنا دشمن ہی سمجھتے ہیں- قطار پر رینگنے لگی تھی- خوشی اور اُمید کی باتیں ہونے لگی - حاجی گل اپنے سامنے ٹینکروں کو دیکھے جا رہے تھے-

حاجی گل نیلے پیلے اور سفید گول ٹینکروں کے نظاروں میں کھویا ہوا آگے آگے کھسکتا جا رہا تھا ٹینکروں کے آس پاس ٹائلوں کا فرش دھوپ میں جگمگا رہا تھا- قطار میں اچانک شور اُٹھنے لگا اُسے بھی دو تین دھکے لگے تو وہ ہوش میں آیا آگے والے آدمی نے بتایا کہ وہ پندرھویں آدمی کے آگے جو سنہرے رنگ کی واسکٹ والا آدمی ہے وہ کہہ رہا ہے کہ یہ پانی کا چشمہ اس کے گھر سے پھوٹا تھا وہ کئی سال تک اس کا پانی فروخت کرتا رہا پھر اس نے سرکاری محکمے کے حوالے کر دیا اس کے بدلے میں اس کے دو بیٹوں کی نوکریاں ملیں تھیں- ایک مکان وغیرہ بھی-

حاجی گل تڑپ کر بولا- میں اسکے قریب جانا چاہتا ہوں - تا کہ اُسکی کہانی سن سکوں- قطار میں کھڑے ترسے ہوئے لوگوں نے الجھنا شروع کر دیا تو حاجی گل تقریر کرتے ہوئے بولا- میں اس سنہری واسکٹ والے آدمی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں - میرا ٹوکن اور میری بوتل میرے پیچھے والے آدمی کے ہاتھ میں ہے میں اپنی باری پہ پانی حاصل کروں گا اگر اس آدمی کے پیچھے والا صرف تھوڑی دیر کے لیے میری جگہ پہ آجائے تو مہربانی ہوگی قطار کے کچھ لوگ تو حاجی گل سے مانوس ہو کر اسکے رعب میں آچکے تھے بہت سے لوگوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو سنہری واسکٹ والے آدمی کے پیچھے جا کھڑا ہوا- آدمی نے پیچھے مڑ کر اسے حیرانی اور ناراضگی سے گھورا تو حاجی گل دوستانہ لہجے میں بولا میں تھوڑی دیر بعد واپس چلا جاؤں گا- میں دراصل یہ سننے آیا ہوں کہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے یا یونہی گپ شپ ہے-

سنہرے واسکٹ والے نے اپنا منہ موڑ کر سنجیدگی سے حاجی گل کو دیکھا حاجی گل کو اسکے کپڑوں سے اُٹھتی ہوئی بہت قیمتی خوشبو لطف دے رہی تھی اس کے دائیں ہاتھ کی

تین انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ وہ درمیانے قد کا مضبوط آدمی تھا اس کے پورے وجود سے دولت اور امارت کا اظہار آرہا تھا اس کے چہرے کی رنگت سرخ اور سفید تھی۔ بہت سرخ اور لمبی ناک کے قریب چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک غرور سا تھا حاجی گل کو اسکی آنکھیں بڑی عجیب سی لگیں اتنی لمبی ناک اور بہت چھوٹی آنکھیں۔ جو لمبائی میں کانوں کی طرف پھسل رہی تھیں۔ بہت دیر کے بعد وہ آدمی بولا۔ ہاں میں سرکاری محکمے میں کلرک تھا۔ یہ سامنے سب سرکاری ادنیٰ ملازموں کی کالونی تھی۔ یہ پہلے ٹینکر کے بالکل پیچھے میرا چھوٹا سا گھر تھا۔ سرکاری نلکوں میں جب پانی آنا بند ہوا تو میں نے گرمی کے شدید دنوں میں اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کے ساتھ مل کر اپنے چھوٹے سے صحن میں کنواں کھودنا شروع کر دیا ایک ماہ کی دن رات مشقت کے بعد ہم نے کنواں نکال لیا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا اور ذائقے میں مختلف تھا ہم نے سرکاری نلکے سے پانی بھرنا چھوڑ دیا چند ہفتے کے بعد ہم پر پانی کی تاثیر کا راز کھل گیا۔ میری بوڑھی ماں کے سینے اور دل کی بیماری ختم ہوگئی۔ میری بڑی بیٹی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے وہ بھی ختم ہوئے مجھے کئی سالوں سے جگر اور مثانے کی تکلیف تھی۔ وہ بھی ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی ہمارے گھر کے سب افراد کی صحت کھل گئی تھی۔ بات محلے اور کالونی میں پھیل گئی پہلے تو ہم عطیہ خداوندی سمجھ کر ہمسایوں میں بانٹتے رہتے لیکن چند رشتہ داروں کی مدد سے میں نے پانی کی قیمت لگادی۔ یوں کئی سال تک ہم پانی بیچتے رہے۔ پھر ایک دن حکومت کے چند اہلکار میرے دروازے پر آگئے انہوں نے پہلے تو مجھے ڈرایا دھمکایا لیکن پھر عزیز رشتہ داروں نے اپنا اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ اور سرکاری عملے نے ایک معاہدے کے تحت مجھ سے کنواں خرید لیا۔ میرے دونوں بیٹوں کو سرکاری ملازمت مل گئی۔ مجھے ایک معقول معاوضہ بھی مل گیا۔ اور وقت سے پہلے مجھے پنشن بھی دیدی گئی اسکے ساتھ ساتھ سعودی عرب میں میرے لیے نوکری کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔

یہ پانی تو واقعی بڑی برکت اور تاثیر والا ہے حاجی گل متاثر ہو کر بولا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں میرے تینوں بیٹیوں کی شادیاں اعلیٰ گھرانوں میں ہوگئیں۔ ہم نے رائل ٹاؤن میں ایک خوبصورت بنگلہ بنالیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے کہ ہم سب سعودی عرب سے واپس آئے ہیں آب وہوا میں تبدیلی کی وجہ سے میرے بدن میں پھر سے امراض پیدا ہوگئے ہیں۔ میری بیوی جوڑوں کے درد اور بلڈ پریشر کی مریض بن گئی ہے۔ میرے ساتھ یہ جو بیٹے اور بھتیجے ہیں ان میں خون کی بیماریاں ہیں جن سے ان کی بصارت کمزور ہوتی جارہی ہے۔

اوہ ہو۔۔۔ حاجی گل افسوس کرتے ہوئے بولا۔ تم نے اور تمہارے عزیزوں اور بچوں نے کتنے سال تک اس کنویں کا پانی پیا تھا۔ ہم تو پانچ چھ سال تک مسلسل پیتے رہے اور خوب مزے کرتے رہے اپنی خوش قسمتی کا اظہار کرتے ہوئے آدمی بولا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی ہوئی۔ تو حاجی گل بھڑک کے قطار سے باہر نکلتے ہوئے چیخا۔ یہ آدمی جھوٹ بکواس کر رہا ہے۔ اسکی للکار سن کر کئی اور آدمی قطار توڑ کر اس کے قریب آ گئے۔ حاجی گل غرایا۔ اس منحوس آدمی کی وجہ سے سرکار نے ہم سے پیسے لے کر ہمیں قطار میں کھڑے کر کے انتظار کی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تاکہ کچھ خاص لوگ آزادی اور سکون سے دُنیا کے فائدے اور مسرتیں حاصل کر سکیں اس آدمی کے پورے خاندان نے کئی برس تک اس کنویں کا پانی پیا ہے اگر اس پانی میں کوئی خاص بات ہوتی تو آج یہ ہمارے ساتھ قطار میں کیوں کھڑا ہوتا؟''

میں آج خود پانی کی تاثیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر حاجی گل نے اپنی زندگی کا پہلا گھونسہ آدمی کے منہ پہ دے مارا۔ وہ بلبلا کے ڈگمگایا تو حاجی گل نے دوسرا گھونسہ دے مارا۔ آدمی کے ساتھ کھڑے ہوئے بیٹے اور بھتیجے حاجی گل پر جھپٹ پڑے۔ لیکن حاجی گل کے گھونسوں نے ان کے بھی ہوش اڑا دیئے۔

تھکن اور اذیت میں کھڑے ہوئے لوگ بھی ان تینوں پر ٹوٹ پڑے۔ قطار مشتعل ہجوم میں بدل گئی محافظوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر حاجی گل نے اتنے گھونسے برسائے۔ اس کے گھونسوں خون دھلے گل چکے میں ایک آواز گونجی۔ ''سالا باکسر ہے۔ اس کے ہاتھ قابو کرو''۔ کئی محافظ حاجی گل پر ٹوٹ پڑے یکا یک ایک سرکاری گاڑی تیزی سے موقع پہ پہنچی تو محافظوں نے لاتوں اور گھونسوں سے حاجی گل کو بے بس کر کے گاڑی میں پھینکا۔ حاجی گل کی بھنویں خون سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے تیزی سے جاتی ہوئے گاڑی سے سر اٹھا کر قطار کی طرف دیکھا قطار ٹوٹ چکی تھی۔ لوگ ٹینکروں کے قریب اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے بوتلیں ہوا میں اچھل کر زمین پہ بکھر رہی تھیں چند لوگ زمین پہ لیٹے چیخ رہے تھے لیکن ان کے پاس کوئی مدد کے لیے پہنچ نہیں رہا تھا۔ حاجی گل نے خون میں بھیگی ہوئی بائیں آنکھ کو اچھی طرح کھول کے دیکھا تو دور اُسے سنہرے واسکٹ والا آدمی بے حس و حرکت اوندھے منہ پڑا نظر آیا۔ اس کی انگوٹھی والی انگلیاں پانی کے ٹینکروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زمین سے کچھ اُٹھی ہوئی تھیں۔ حاجی گل نے نعرہ لگاتے ہوئے کہا ''قطاریوں ٹوٹتی ہے'' اس کی بات سن کر ایک محافظ نے اسکی پشت پر زور سے لات دے ماری۔ تو حاجی گل قہقہے لگاتے ہوئے بے دم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

انٹرن شپ

جمیل احمد عدیل

یہ اس دور کا قصہ ہے، جب میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے اینٹری ٹیسٹ کی بدعت کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

اور

یہ عین اسی روز کا واقعہ ہے جب حکیم عبدالعزیز ناگی نے مجھے اپنا دستِ راست بنانے کا فیصلہ کرلیا----

---

دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو، جو بھی عطریات بیچ رہا ہے، وہ زمین پر خوشبوؤں کا تقسیم کار ہے۔ جو شہد کی تجارت کر رہا ہے، وہ حقیقتاً شِفا بانٹ رہا ہے۔ یہ کسی طرح درست سوچ نہیں ہوگی کہ اپنے: عطر، شہد، عرق--- کو خالص ثابت کرنے کے لیے دوسرے کی اِن پروڈکٹس کو جعلی/ ناقص قرار دے ڈالا جائے! باقی عجز کے ساتھ کہتا ہوں، یہ میرا میدان ہے؛ طبابت کے دشت کی سیاحی میں میری عمر بیتی ہے؛ سو، اس مناسبت سے شناسائیاں رہی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نقلی مال خریدتا ہوں، بیچتا ہوں نہ خود

استعمال کرتا ہوں۔ کسی کو جعل ساز کہنا میرے اعتقاد کے خلاف ہے۔ میری نظر میں سب مکرم، سب محترم ہیں ___ علاوہ ازیں ذرا سوچو تو سہی کہ: عطریات، عرقیات، خشک میوہ جات، دیسی گھی، زیتون کا تیل، کلونجی اور شہد فروخت کرنے والا، منشیات یا اسلحہ بارود کو بھی اپنا کاروبار بنا سکتا تھا۔ اگر اس نے اول الذکر نعمتوں کا چناؤ کیا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ فطرتاً مثبت طرز احساس کا مالک ہے۔ وہ دل سے ماحول کو مہکانے کا آرزومند ہے۔ وہ لوگوں کو توانا دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے!!

مذکورہ نقطہ نظر اپنی انفرادیت اور تعمیری صفت کے سبب ہی کچھ کم جاذب نہیں تھا۔ اس پر مستزاد حکیم عبدالعزیز ناگی کے لہجے میں خطابت کی خفی تندی بھی موجود نہیں تھی۔ یوں بادی النظر میں امکان نہیں تھا کہ ان کا تکلم مخاطب کی سماعت کے لیے کسی قسم کی گرانی کا باعث بنے گا۔ مجسم تحمل عبدالعزیز ناگی ایک حاذق طبیب تھے۔ ستتر برس کی عمر کو پہنچی ہوئی ان کی شخصیت کو محور کن پیکر عطا کرنے میں اگرچہ ان کی جادو بھری گفتگو بنیادی کردار ادا کرتی تھی لیکن ان کے بے ریش بیضوی چہرے کی معصومیت سے کہیں بڑھ کر ان کے سر اور گھنی بھوؤں کے بالوں کی چمکتی سفیدی طلسم اعظم کا مفہوم سمجھاتی تھی۔ وہ مریضوں اور مریدوں سے کلام کرتے تو سانسیں تھم سی جاتیں کہ برہان کا نور ان کے پورے وجود کے گرد مستقل ہالہ قائم رکھتا۔ ذوقی استدلال پر معروضی استدلال ان کی ایسی ترجیح تھی، جس پر مفاہمت کی کم کم گنجایش ہی ممکن دکھائی دیتی۔ کچھ یہی وجہ بنی ہوگی کہ عمومی صلح کل برتاؤ کے باوصف فکر و نظر سے طبعاً نالاں ان سے بھی نالاں ہی رہے کیونکہ روایت پسندوں کا نفور اس حجت سے توانائی پاتا تھا کہ عقلیت کو محور بنائے رکھنا ذہنی خلل کا شاخسانہ ہے۔ ان کی دانست میں حکیم ناگی نے اپنی نجی محرومیوں سے مامون رہنے کے لیے عمر بھر 'تعقیل' کو پناہ گاہ بنائے رکھا۔ ایسا نہیں کہ حکیم عبدالعزیز اس نکتہ چینی سے بے خبر تھے، بس ان کا اپنا اسلوب حیات تھا کہ وہ پیٹ کے گہرے تھے، یوں ردعمل ظاہر کرنے کی جانب زیادہ میلان نہیں رکھتے تھے۔

اس زمانے میں ہم لڑکے بالے تھے۔ فراغت کی اہمیت سے اس لیے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے کہ یہ 'کمیاب جنس' فراوانی

سے میسر تھی۔ ''مطب ناگی'' کے نہایت لذیذ مقویات اپنی جگہ لیکن اصل کشش کا مرکزہ حکیم صاحب کا ہفتہ وار درس تھا، جو ہم یارانِ نجد کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا۔ اس لیے کم وبیش دو برس دھیان اور قدموں کے رخ میں کوئی مغایرت واقع نہیں ہوئی۔ جب دلچسپی میں اور اضافہ ہوا تو اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ مل کر، باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے کئی بار حکیم عبدالعزیز ناگی کی 'ریکی' کی تاکہ یہ معلوم ہو سکے، ان کے کاروباری روابط کن لوگوں سے ہیں؟ اس مقصد میں جزوی کامیابی تو ہوئی لیکن نتیجہ کچھ بے سود سا رہا کیونکہ جو مال بھی یہ منگواتے، اسے اپنے معمل میں کسی نادیدہ پروسیس سے ضرور گزارتے ہوں گے کہ بہرحال اپنے اثر اور لطف میں وہ مختلف ہو جاتا تھا۔ اسی لیے ان کے دواخانے سے دستیاب: عرق، عطر، روغن، شربت، قہوہ، سرکہ، ابٹن، شہد، کشتہ، سفوف، سرمہ، پھکی، خمیرہ، بام، منجن، جوشاندہ، خیساندہ، چھلکا، خضاب، مغز، لعوق، معجون، جوارش، مربہ، چورن، خشک میوہ، لوزینہ، مربا وغیرہ غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ لوگ باگ دور دور سے آتے، نہ صرف حکیم صاحب سے علاج معالجہ کراتے بلکہ اپنے شوق سے یہ دوائیں/غذائیں وافر مقدار میں خرید کر اپنے ہمراہ بھی لے جاتے۔

حکیم ناگی کے دواخانے سے منسوب ایک تحفہ خاص الخاص سمجھا جاتا تھا اور وہ تھا لطافت کا سچا مترادف عرق گلاب! ویسے تو شہد اور کلونجی بھی مشہور تھے مگر عرق گلاب کی کیا بات تھی! سچی بات ہے ہم نے بچشم خود کبھی انھیں یا ان کے کارندوں کو گلابوں کی جمع کاری میں مصروف نہیں پایا، تاہم ان سے یہ بات کئی بار سنی ہوئی تھی: جو گلاب موسم بہار میں سورج طلوع ہونے سے قبل ہاتھوں سے توڑے جائیں، ان کا حاصل عطر کی شکل میں ہو یا عرق کی صورت، اس کا جواب نہیں! یہی وجہ ہو گی کہ باذوق مردوزن آنکھیں بند کر کے ان سے عرق گلاب منھ مانگی قیمت پر خرید کے لے جاتے تھے۔ عرق گلاب میں خواتین کی دلچسپی کا سبب یہ بھی تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے اشتہارات کے ذریعے زنان مشرق کو یقین دلا دیا تھا: اگر تمھاری جلد شاداب نہیں تو مردوں کی نگاہوں میں تم بیمار مخلوق ہو! نیز جلد کی تازگی اور چمک کے لیے فرشتے اب تلک صرف عرق گلاب کو صحیفہ بنانے میں

بامراد ہو سکے ہیں! چنانچہ اسے نوشِ جاں کرنا اور اس سے چہرے کو روزانہ دھونا مفید ہی نہیں اکسیر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کیل مہاسوں، چھائیوں جھریوں سے ستائی ہوئی عورتوں کے لیے: عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کے رس سے الگ آمیزیدے بھی تیار کرا رکھے تھے۔ مختصر یہ کہ عرق گلاب کے لیے انھوں نے 'مقطر سیال بصورت تقطیر' ایسی مرعوب کن ڈکشن استعمال کرتے ہوئے طبی خواص کو اجاگر کرتا ہوا لٹریچر گھر گھر پہنچا دیا۔ یوں خلق خدا نے مان لیا تھا کہ نیند کی کمی سے لے کر فشار الدم تک جملہ عوارض کا موثر دفعیہ اسی آب زلال میں ہے جسے 'ناگی ماء الورد' کہا جاتا ہے۔

'مطب ناگی' پر زیادہ آمد و رفت تو حکیم صاحب کے متاثرین کی تھی لیکن اجنبیوں کے لیے یہ در ہرگز بند نہیں تھا۔ بعض اوقات 'پامال تجربیت' کے مارے ہوئے بھی آن گھستے تو دلچسپ سا ماحول بن جاتا۔ مثال کے طور پر کوئی کلونجی کے چند دانے طلب کرتا اور انھیں سفید کاغذ میں لپیٹ کر دیکھتا کہ چکنائی کے دھبے ابھر رہے ہیں یا نہیں؟ کوئی اپنے دماغ میں سمائی سائنسدانی کو رام کرنے کے لیے موم بتی میں پروئے ہوئے کاٹن کے موٹے دھاگے کو شہد میں بھگو کر اسے جھٹکتا اور پھر ماچس کی تیلی کے ذریعے اسے شعلہ دکھاتا۔ اگر بتی جلنے لگتی تو اسے اعتبار آ جاتا کہ شہد خالص ہے۔ اسی طرح کوئی عرق گلاب کو سونگھ/ چکھ کر اندازہ لگاتا کہ اس کی خوشبو تلخ ہے یا نہیں؟ ذائقہ بدمزہ ہے یا نہیں؟

یہ سارے کرتب دیکھتے ہوئے حکیم ناگی اندر ہی اندر مسکراتے ضرور ہوں گے کہ ایک تو مشتری نووارد ہے؛ دوسرے یہ کہ اسے خود کو اپنی سمجھداری باور کرانے کا خبط لاحق ہے؛ لیکن اس تماشے میں وہ اپنی لاتعلقی پہ حرف نہیں آنے دیتے تھے اور پروفیشنلزم کا یہ زاویہ بھی ان کی کامیابی کا ضامن تھا۔

یہاں یہ ذکر ضرور کیا جائے گا، کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ حکیم ناگی نے عرق گلاب فروخت کیا ہو اور گاہک کو ساتھ سوکھی پتیوں کا 'پڑا' نہ تھمایا ہو۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات تھی! ایک روز میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا:

حکیم صاحب! اس عمل میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

اپنے خاص ملائم لہجے میں گویا ہوئے:

یہ عرق گلاب کی اصل ہے۔ اسے جدا کر دیا

گیا تو عرق کے بعض اجزا اپنی تاثیر سے محروم ہو جائیں گے!!

میں نے بلا توقف دلیل چھانٹی:

جب پنکھڑیوں سے عرق کشید کر لیا گیا تو اس سے وابستہ پھوک کو کیا کرنا ہے؟

وہ بے ساختہ مسکرا دیے:

بچے! یہ تو خود غرضی ہوئی نا، کہ جس سے سب ملا، اسے ہی الگ کر کے پھینک دیا جائے___ ملائکہ جو لائے، مانا کہ وہ اہم ہے، پر جس رات میں لائے، اس کی فضیلت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے___ مظروف کی وقعت کو تسلیم کرنا صاحبِ ظرف کا حوصلہ ہے! اور تو اور ایک عہد کے فیورٹ ٹیگور نے بھی فنونِ لطیفہ کی روحانیت کو ثابت کرنے کے لیے گلاب اور خوشبو کے مابین زندہ رشتے پر انحصار کیا ہے۔ اسی اٹوٹ ناتے کو مطلق سچائی کا وسیلہ بنایا ہے___ ذہین لڑکے! اکائی پر کرنا سیکھو!!

باتیں بلاشبہ گہری تھیں مگر اپنی عمر بھی ایسی طوفانی تھی کہ کٹ حجتی کو لذت کا خزینہ مانتے تھے:

لیکن آپ ان خشک پتیوں کی افادیت بتا دیں!

انھوں نے اپنا کپکپاتا ہاتھ میرے شانے پہ رکھتے ہوئے دریافت کیا:

تم کس کلاس میں پڑھتے ہو؟

میں نے سینہ پھلا کر بتایا:

ایف ایس سی کر چکا ہوں۔ میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہونے والا ہے!

وہ دھیرے سے لب کشا ہوئے:

اس کا مطلب ہے تم بات کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہو___ مجھے بتاؤ! جب لفظ سے معنی کھینچ لیتے ہو تو کیا وہ پھوک رہ جاتا ہے؟

ایک بار تو میں چکرا گیا مگر جلد ہی سنبھل گیا:

تو اور کیا! اصل چیز بادام کی گری ہے، چھلکا نہیں!!

لیکن حکیم ناگی نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے:

برخوردار! تمھاری بات دل کو لگتی ہے پر مغز اور لفظ میں جو اساسی رشتہ ہوتا ہے اسے قائم رہنا چاہیے! تم شاید جانتے نہیں ہو، جن پتیوں سے عرق نکالا جاتا ہے وہی خریدار کے حوالے کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عرق دیسی گلاب کی قسم، گلابی مائل احمریں، ہلکی مہک والے 'سیوتی' کا ہو اور عرق مول لینے والے کے ہاتھ میں سیاہی مائل سرخ، تیز خوشبو کے مالک 'سندھی' کی سوکھی پتیاں دے دی گئی ہوں!

میرے لیے یہ انکشاف تھا، سو، دم بخود ہو کر رہ گیا! لیکن معاً اپنے اندر کے 'بخشیے' کو تھپکی دی:

پہلی بات تو یہ ہے کہ تاثیر عرق میں ہوا کرتی ہے، خشک پتیوں میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ عین مین عرق والی پتیوں کا حساب کتاب رکھنا کیا قابلِ عمل ہے؟

حکیم صاحب نے طنطنے اور تمکنت کی آمیزش سے لہجے کی 'پوٹینسی' بڑھائی، اپنی آنکھوں کا رنگ آن ہی آن میں بدلا اور بولتے چلے گئے:

میں 'تمباکو باتھی' کے ٹوٹکے سے بخار اتارنے والا مدعی نہیں ہوں، جس کے منتر:
بھوکا ہے تو آگ کھا اور پیاسا ہے تو پانی پی!
سنتے ہی تاپ دم دبا کے بھاگ جاتا ہے!

سوہنے کاکے! مجھے خبر ہے تم ایم۔بی۔بی۔ایس کے بعد سپیشلائزیشن کرنے امریکا جاؤ گے۔ ایسا ہی خواب دیکھتے ہو نا؟

میں نے بے اختیار 'ہاں' کہہ دیا حالاں کہ اس وقت ایسا کوئی سپنا میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا!___ اگرچہ بعد میں ایسا ہی ہوا___!

جب وہاں جاؤ گے تو دیکھنا امریکی اپنے قومی پھول گلاب، پہ کیسے صدقے واری جاتے ہیں لیکن وہ فقط رنگ ہے، بالکل بے بو ولایتی بابو کی مانند؛ جو بچی خوشبو میں نہایا ہوا ہے اسے 'گلاب دمشق' کہتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران مغربی جنگجو وسط ایشیا سے جو: علم، ہنر اور متعدد نوادر یورپ لے گئے ان میں ایک گلاب دمشق بھی تھا___ اب اپنی بھینی باس میں بسا گلاب جنوب مشرقی یورپی خطے بلغاریہ میں اُگتا ہے___ یہ تاریخ کے پنے ہیں میری گھڑنت نہیں! تم ان ماہرین شماریات کو کیا بحرِ اوقیانوس میں ڈبو ڈالو گے جنھوں نے گلاب کی دس ہزار اقسام گنوائی ہیں؟ کسی سر پھرے نے تو جا کر جنگلی گلاب کی پنکھڑیاں گنی ہوں گی کہ پانچ ہوتی ہیں جبکہ چمن میں ایک جنگلی قسم چار پنکھڑیوں پہ جھومے جا رہی ہے۔ پانچ ایکڑ رقبے پر گلاب کاشت کیا جائے تو اس سے چھ ٹن گلاب کی پتیاں حاصل ہوتی ہیں___ تو میاں! کچھ ریاض ہم سے بھی نسبت رکھتا ہے، تھوڑی سی ریاضی ہمیں بھی آتی ہے! بند ہونے کے قریب ہی مگر یہ آنکھ ابھی کھلی ہے!!

حکیم ناگی نے تو یکدم میری بولتی بند کر دی! اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ جواب آں غزل کے طور پر میں بولا تھا یا حکیم ناگی کی طرح میری انا متکلم ہوئی تھی لیکن جو بھی

ہوا برابری کی سطح پر ہوا:

حکیم صاحب! ریسرچ کر کے یہ پھر کبھی بتا دیجیے گا کہ سوکھی پنکھڑیوں کی شمولیت سے عرق میں کون سی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے ___ فی الوقت مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ نے لفظ اور معنی والا جو نکتہ پیش کیا تھا، اس کی بقیہ اصولی وضاحت سن لیں:

ایک لفظ کے کئی کئی معانی ممکن ہیں!

اس پر وہ اور برہم ہو گئے:

ایسا نہیں ہو سکتا! ایک لفظ کا ایک ہی اصلی معنی ہوا کرتا ہے۔ تم نئے نئے پڑھے لکھوں کا یہی مسئلہ ہے کہ تم معنی پہلے سوچتے ہو، پھر اس کے حسب حال نیا لفظ ایجاد کر لیتے ہو! یوں ٹینکی میں پٹرول کی جگہ پانی بھر لیتے ہو!!

یہ جو کچھ ہو رہا تھا، میرے لیے معمول سے یکسر ہٹ کر تھا کہ حکیم صاحب کے چہرے سے ان کی 'دائمی' حلیمی رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ طنز کی سلوٹ لے چکی تھی۔ سو یہ ساعت بہت نایاب تھی کہ وہ منکشف ہونے کے نزدیک پہنچ چکے تھے لہٰذا اس گھڑی کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا:

حکیم صاحب! حیران اس لیے ہوں کہ ایک طرف خرد کی میزان سے آپ کی جرأت ضرب المثل بن چکی ہے، دوسری جانب یہ قضیہ کہ ایک لفظ کی پنکھڑی سے اگر ایک سے زیادہ معانی کے عرق کشید نہ کیے جا سکیں تو گاہک کو منڈھ دیے جانے والے اس 'پڑے' کی کیا زیارت ہی مقصود ہے؟

یہ اس دور کا قصہ ہے، جب میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے اینٹری ٹیسٹ کی بدعت کا نام ونشان تک نہیں تھا

اور

یہ عین اسی روز کا واقعہ ہے جب حکیم عبدالعزیز ناگی نے مجھے اپنا دستِ راست بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس صورت حال پر میرے والد صاحب بہت خوش تھے کہ اس بہانے میڈیکل کالج میں کلاسز شروع ہونے تک ان کا اُتھرا بیٹا آوارہ گردی سے باز رہے گا ___ اور حکیم ناگی کو میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ انھوں نے مثالی اعتماد کرتے ہوئے، اگلے ہی دن مجھے اس الماری کی چابی عطا کر دی جس کے زیریں خانے میں گتے کا ایک کافی بڑا ڈبا دھرا تھا جس میں پورے بندوبست کے ساتھ خشک پنکھڑیاں محفوظ تھیں!!

☆☆☆☆☆

گل دان

انعام الحسن کاشمیری

''آپ ہر وقت یہ کیا لکھنے پڑھنے میں مگن رہتے ہیں۔ جب دیکھو ہاتھ میں کاغذ قلم ہے یا کوئی کتاب---''

''تمھیں علم تو ہے کہ لکھنا پڑھنا میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ تم وہ نصیحت بھول گئیں جو میں نے شادی کے بعد پہلے دن تمھیں کی تھی؟''

''کوئی الٹی سیدھی نصیحت ہی کی ہوگی! مجھے تو اتنے برسوں کے بعد کچھ یاد نہیں رہا۔''

''یہ بتاؤ جب تمھاری رخصتی ہوئی تھی تب تم کس رنگ کے عروسی لباس میں تھیں؟''

''گہرے سرخ رنگ کا تھا، قمیص کے دامن پر گوٹا کناری کا بڑا دیدہ زیب کام کیا گیا تھا اور پشت پر خوبصورت پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اور ولیمے پر تم نے کس رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا؟''

''ولیمے پر نیلے آسمانی رنگ کا سوٹ تھا جس پر زری کا بھاری بھرکم کام کیا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے تب میری سہیلیوں اور سب دیکھنے والیوں نے اس سوٹ کی بے حد تعریف کی تھی کہ یہ مجھ پر خوب جچ رہا ہے اور غضب ڈھا رہا ہے اور جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا تب واقعی مجھے خود پر بے حد پیار آنے لگا تھا اور ہاں یاد آیا آپ نے بھی تو تب میری بہت تعریف کی تھی۔''

"جوتوں اور پرس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ تمہیں یاد نہیں ہوگا کہ کس رنگ کے تھے!"

"کیوں نہیں --- وہ بھی یاد ہے کہ کس رنگ کے تھے لیکن آپ بتایئے تو سہی کہ ان سب باتوں کے آج پوچھنے کا مقصد؟"

"اب بھی دیکھ لو! تمہیں یہ تو یاد ہے کہ رخصتی اور ولیمے والے دن کس کس رنگ کے سوٹ پہن رکھے تھے، سینڈل اور پرس کا رنگ کیا تھا اور سہیلیوں نے کیا کیا باتیں کی تھیں لیکن یہ یاد نہیں کہ میں نے ضروری اور واحد نصیحت کیا کی تھی اور اس کی بابت سختی سے کہا تھا کہ اس نصیحت کو ساری زندگی اپنے پلے باندھ کے رکھنا۔"

"آپ پہیلی نہ بجھوائیں، خود ہی بتا دیں، اب میری یادداشت اتنی بھی اچھی نہیں کہ ہر بات یاد رکھوں۔"

"تم عورتوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ اپنے کپڑوں، جوتوں، پرسوں اور میک اپ کے سامان وغیرہ کے بارے میں تو ذرا ذرا بات ساری زندگی یاد رہتی ہے لیکن کام کی بات اگلے دن ہی بھول جاتی ہو۔"

"ایسی بات بھی نہیں --- ہم عورتیں بھی آپ مردوں کی طرح انسان ہی ہیں۔ چلیے مان لیا کہ ہم کام کی بات اگلے دن ہی بھول جاتی ہیں لیکن آپ کو کچھ اپنے بارے میں پتا ہے کہ صبح دفتر جاتے ہوئے جو بات کہی جائے مجال ہے کہ وہ شام تک یاد بھی رہے۔"

"تم اپنے تئیں جو بات بہت ضروری خیال کر کے بتایا کرتی ہو، اُسے یاد رکھنا اتنا بھی لازمی نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ دفتر سے واپسی پر فلاں چیز لے آنا اور جب نہیں لاتا تو تمھارے یاد دلانے پر شام کو بازار سے لے آیا کرتا ہوں۔"

"تو آپ بھلکو ہوئے نا اور الٹا الزام ہم پر کہ ہم بھول جاتی ہیں۔"

"بھلکو نہ کہو مصروفیات کا بار کہو، تم کیا جانو کہ سارا دن دفتر کے بکھیڑوں میں الجھے اپنا خیال تک نہیں رہتا۔"

"واہ! اور میں یہ جو سارا دن آپ کے چار جگر گوشوں کو سنبھالے رکھتی ہوں، یہ کسی مشقت سے کم ہے کیا! آپ کو اگر انہیں ایک دن کے لیے سنبھالنا پڑ جائے تو آپ دفتر کیا، اپنا آپ بھی بھول جائیں، کانوں کو الٹے ہاتھ لگائیں۔"

"چھٹی کے روز تو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں نا، مجھے تو ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ جس کی وجہ سے تم ان کے ہاتھوں سخت پریشان اور الجھن زدہ ہو جاتی ہو۔"

"چھٹی والے دن تو آپ پہلے صبح دیر تک سوئے رہیں گے، پھر اٹھ کر گھومنے پھرنے کے لیے نکل جائیں گے یا کسی عزیز کے ہاں پہنچ جائیں گے، شام کو کمرے میں بند لکھنے پڑھنے میں مگن ہو جائیں گے - ایسے میں ایک دن ہی میں آپ کو کیا معلوم ہو کہ میں

کیسا جھنجھٹ اور اذیت برداشت کرتی ہوں۔"

"جھنجھٹ یقیناً ہوتا ہوگا، میں یہ نہیں کہتا کہ تمھیں سارا دن سخت کوفت سہنا نہیں پڑتی لیکن تم بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی ہو۔"

"مجھ پر سارا دن جو بیتتی ہے تو کیا وہ بیان بھی نہ کروں؟ اور یہ جو آپ کہانیوں، افسانوں اور غزلوں میں اپنے تن بیتی باتوں اور اپنے دل کا احوال لکھتے رہتے ہیں، یہ کیا ہے؟"

"تم سے ایسی بات کی ہرگز توقع نہ تھی، لازمی نہیں کہ میں جو کچھ لکھتا یا بیان کرتا ہوں، وہ میرے دلی جذبات ہی ہوں کہ جن کی تپش میرے وجود نے محسوس کی ہو۔ کچھ چیزیں دیکھ کر، مشاہدہ کر کے اور دوسرے کے احساسات جان کر بھی احاطۂ تحریر میں اس طرح لائی جاتی ہیں کہ پڑھنے والا یہی سمجھے کہ جیسے وہ خود اس کیفیت اور حالات میں سے گزرا ہے اور میں نے اُسی کا تجربہ اپنے ادراک کے زور پر بیان کیا ہے۔"

"آپ لکھاری ہیں، اسی لیے کیسی خوبصورتی کے ساتھ صاف پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں نے جو اتنا کچھ لکھ رکھا ہے، اور اب بھی جو دن رات لکھتا رہتا ہوں یہ سب میرے ذاتی تجربات، میرے قلبی واردات ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ سارے نہ سہی، کم از کم آدھی سے زیادہ تحریریں تو ضرور آپ کے اپنے حالات و واقعات ہیں۔"

"تو پھر سمجھتی رہو، اس میں میرا کیا جاتا ہے۔"

"دیکھا! سچائی بڑی تلخ ہوتی ہے۔ اب میں حقیقت جو بیان کرنے لگی ہوں تو آپ جواب دینے سے کنی کترا رہے ہیں۔"

"سچ تو یہ ہے کہ تم عورتوں سے بحث میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ تم نے شاید اُس چینی فلاسفر کا قول نہیں سنا جس نے کہا تھا کہ جب طوفان اور آندھی آئے تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیے۔ اسی طرح جب بیوی بحث پر اتر آئے یا جھگڑا کرنے لگے تو تب بھی بھلائی اسی میں ہوتی ہے کہ مقابلہ کرنے کے بجائے پناہ تلاش کی جائے۔"

"آپ اب بات کا رخ بدل رہے ہیں۔ مجھے سب پتا ہے کہ آپ شادی سے پہلے کیا کرتے رہے ہیں؟"

"شادی سے پہلے ہر انسان جو کچھ کرتا ہے، میں نے بھی وہی کچھ کیا۔ اس ناطے میں مجرم یا ملزم ہرگز نہیں کہ جس کا مجھے کوئی افسوس یا پچھتاوا ہو۔"

"غلط کیا، آپ تو دودھ کے دھلے ہوئے ہیں، غلط تو میں ہوں کہ جس نے آپ کی شرافت، ملنساری اور شرمیلی آنکھوں پر اعتبار

کیا اور جانا کہ آپ اچھے شریکِ حیات ثابت ہوں گے۔''

''تو میں نے تمھیں کیا دکھ، تکلیف پہنچائے ہیں جو آج تم اپنی قسمت کے پھوٹے پن پر رونے بیٹھ گئی ہو۔''

''کیا یہ رونا کم ہے کہ آپ کو میری ذرا برابر پروا نہیں، بس جب دیکھو یہ نگوڑی کا پیوں اور کتابوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔''

''اف خدایا! تو کیا اب میں اجڈ گنوار شوہروں کی طرح صبح وشام تمھاری بے عزتی کیا کروں، بات بات پر تمھاری دھنائی کر کے رکھ دیا کروں، اسی کو تم پروا کرنا کہتی ہو؟''

''میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ ایسا کریں، بس دل سے احساس کرنے کی بات ہوتی ہے جو کہ آپ کرتے نہیں۔''

''تم نے آج تک جو کچھ مانگا ملا، جو کرنا چاہا کیا، کہیں آنے جانے میں تمھیں کوئی روک ٹوک نہیں، یہاں تک کہ آج تک میں نے کسی معاملے میں تمھیں برا بھلا نہیں کہا اور تمھاری رائے کو ہمیشہ فوقیت دی، تمھاری پسند کو ترجیح دی لیکن تمھارا کہنا ہے کہ میں نے کبھی دل سے تمھارا احساس نہیں کیا۔''

''یہ تو آپ میرا دل رکھنے کے واسطے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ حقیقت تو اس کے بالکل الٹ ہے، اب یہی دیکھ لیجیے کہ میں اتنے چاہ سے نقش ونگار سے مزین چینی کا یہ خوبصورت گل دان لے کر آئی تھی کہ آپ میری پسند اور خرید کی خوب داد دیں گے لیکن آپ نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔''

''بھئی تم نے تو آتے ہی بحث شروع کر دی تھی اور مجھے موقع ہی نہیں دیا کہ میں کسی اور طرف بھی دھیان دے پاتا۔''

''بحث کے دوران بھی تو آپ نے کئی مرتبہ نظریں گھما کر گل دان پر ڈالیں، میں برابر تاڑتی رہی ہوں۔''

''میرا ذہن ہی اس طرف نہیں گیا کہ تم بازار سے اس قدر خوبصورت گل دان خرید لائی ہو۔''

''اب ذہن چلا ہی گیا ہے اس طرف تو بتا دیں کہ کیسا ہے یہ؟''

''بہت ہی خوبصورت ہے یہ، تمھاری پسند اور خریداری پر بے اختیار داد دینے کو دل کرتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ خوش قسمتی سے کہیں سے تمھارے ہاتھ لگ گیا ورنہ ایسی خوبصورت اور نایاب چیزیں اب بازاروں میں بھلا کب ملتی ہیں۔''

''جی بالکل! ایک دکان پر رکھا ہوا تھا کہ میری نظر اس پر پڑ گئی اور میں نے فوراً مول تول شروع کر دیا، دوسری عورتیں اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے انتظار میں رہیں کہ کب میں اسے چھوڑتی ہوں اور وہ لپک کر اسے جھپٹ لیتی ہیں لیکن میں نے نہ چھوڑا اور آخر کار لے ہی آئی۔''

''تم نے یہ بہت اچھا کیا، اب اس سے گھر

خوب سجے گا۔"

"میرا ارادہ ہے کہ اس میں پھول ڈال کر ڈرائنگ روم میں رکھ دوں۔"

"ہاں--- یہ خیال اچھا ہے۔"

"لیکن وہاں رکھنے کا تو کوئی فائدہ نہیں، یہاں کون سی مہمانوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں کہ کوئی اِسے دیکھے گا، ایسا کرتی ہوں کہ اِسے باہر گیٹ کے ساتھ والی دیوار پر لگوا دیتی ہوں، آتے جاتے اِس پر نظر پڑے گی تو دل خوش ہوگا۔"

"ہاں--- یہ بھی اچھی تجویز ہے، لاؤ پھر میں اِسے وہاں لگا دوں۔"

"نہیں نہیں--- آپ کے ہاتھوں سے یہ ٹوٹ جائے گا، ایسا کرتے ہیں اِسے بیڈروم کی شیشے والی الماری میں رکھ دیتے ہیں۔ وہاں یہ خراب ہونے اور ٹوٹنے سے محفوظ رہے گا۔"

"بھئی جیسے تمھاری مرضی، تمھاری چیز ہے تو جہاں چاہو، اِسے رکھو۔"

"اتنے شوق اور ارمان سے خرید کر لائی ہوں، میں بڑے عرصے سے کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جو میری کسی جاننے والی کے پاس نہ ہو، آخر آج مجھے ایسی چیز مل ہی گئی۔"

"پھر تو تم بے حد خوش قسمت واقع ہوئیں۔"

"یہ بہت نازک ہے، میں نہیں چاہتی کہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور وہ اِسے پل بھر میں ٹکڑوں میں بانٹ کر رکھ دیں۔"

"جہاں رکھو گی، وہاں بچوں کا ہاتھ تو لازمی پہنچے گا۔"

"پھر آپ ہی ایسی کوئی ترکیب لڑائیں کہ یہ کسی ایسی جگہ پر لگ جائے جہاں ہر آنے جانے والے کی نظر پڑتی رہے اور جو کوئی اسے دیکھے وہ میری پسند کی داد بھی دے۔"

"اچھا! پھر تو سوچنا پڑے گا کہ اِس نازک آبگینے کو کس مقام پر نصب یا آویزاں کیا جائے۔"

"ہاں نا! بس میں چاہتی ہوں کہ راحیلہ اِسے ایک بار ضرور دیکھ لے، اُسے بڑا زعم ہے کہ اُس کے گھر میں بڑی قیمتی اور نایاب اشیاء موجود ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جب وہ اس گل دان کو دیکھے گی تو ضرور اس کے حاصل کرنے کی تمنا کرے گی۔"

"وہی راحیلہ جس کے شوہر کا چند برس پیشتر انتقال ہو گیا تھا؟"

"جی جی وہی--- بیچاری تنہا زندگی بسر کر رہی ہے، کوشش میں ہے کہ کوئی اِس سے شادی کر لے۔"

"یہ بھی کیا ظلم ہے، ابھی تم ذکر کر رہی تھیں کہ تمھیں دن رات گھر کے کاموں اور بچوں کی دیکھ بھال میں الجھے رہنے کے باعث خود پر توجہ دینے کا بھی وقت نہیں ملتا؟"

"ہاں ہاں--- ایسا ہی ہے، اب دیکھیں نا چار بچوں کو سنبھالنا کوئی آسان کام تو نہیں، آپ تو صبح تیار ہو کر دفتر چلے جاتے ہیں اور پیچھے سارا دن بچے جو اودھم مچا رکھتے ہیں گویا

میری جان کو مسلسل عذاب میں ڈالے رکھتے ہیں، ایسے میں پھر کھانا پکانا، برتن مانجھنا اور کپڑے وغیرہ دھونا، صفائی ستھرائی کرنا یہ سب کام میں بڑی مشکل سے کر پاتی ہوں۔"

"اور تم نے ابھی شکوہ کیا تھا کہ مجھے تمھاری کوئی پروا، کوئی احساس نہیں؟"

"سچ ہے کہ آپ کو میری واقعی کوئی پروا نہیں، ایسا نہ ہوتا تو اتنے برسوں بعد مجھے آپ سے گلہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔"

"تو ٹھیک ہے پھر، میں جلد ہی تمھارا یہ گلہ دور کیے دیتا ہوں، کل ہی میں اماں کے ہاں چلوں گا انہیں کہنے کہ وہ تمھاری پروا کرنے کے سلسلہ میں میری مدد کریں۔"

"لیکن اماں اس معاملے میں ہماری بھلا کیا مدد کر سکتی ہیں۔ وہ تو یہاں آ کر رہنے سے رہیں، بیچاری بے حد ضعیف اور لاغر ہو چکی ہیں اس عمر میں۔"

"لیکن اتنی بھی لاغر نہیں ہوئیں کہ راحیلہ کے گھر نہ جا سکیں۔"

"کیا مطلب؟ راحیلہ کے گھر وہ بھلا کس مقصد کے لیے جانے لگیں!"

"راحیلہ کا رشتہ مانگنے، میں نے ابھی ابھی سوچ لیا ہے کہ راحیلہ سے عقد ثانی کر لیتا ہوں، اس طرح اُس بیچاری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور تمھیں بھی گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے ایک دوسری عورت مل جائے گی۔"

"خبردار جو آپ نے ایسی کوئی بات کی۔"

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ مجھے تمھاری کوئی پروا، فکر اور احساس نہیں۔"

"وہ تو میں بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔"

"نہیں، نہیں-- میرا خیال ہے اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمھاری مدد کروں اور اتنی الجھنوں، کوفتوں اور اذیتوں سے تمھاری خلاصی کروا دوں۔"

"خبردار جو آپ نے جا کر اماں سے ایسی کوئی بات کی، میں گل دان مار کر راحیلہ کا منہ توڑ ڈالوں گی۔"

"اُس بیچاری کا منہ توڑنے کی کوشش میں تمھارا یہ عزیز از جان گل دان بھی تو سلامت نہ بچے گا۔"

"مجھے کسی چیز کی کوئی پروا نہیں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ مجھے تمھاری پروا نہیں اور اب کہہ رہی ہو کہ تمھیں کسی کی پروا نہیں، ہم دونوں کو آخر کس کی پروا ہے پھر؟"

"مجھے کچھ نہیں پتا! گل دان گیا بھاڑ میں، میں راحیلہ کو سرے سے ہی منع کر دوں گی کہ وہ یہاں نہ آیا کرے-- آپ کون سی کہانی لکھ رہے تھے؟ اچھا وہی لکھتے رہیے، میں خوامخواہ آپ کا وقت ضائع کر رہی ہوں۔ مجھے ابھی گھر کے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔"

"اور اس گل دان کا کیا کرنا ہے؟"

"آپ اِسے اپنے مطالعہ والی میز پر سجا لیجیے، وہاں یہ خوب جچے گا۔"

☆☆☆☆☆

کھڑکی

''بابا؟''

''جی بیٹا؟''

''یہ اتنے زیادہ لوگ نئی سڑک پہ کیا کر رہے ہیں؟''

بابا مسکرانے لگے --------

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ کھڑکی ہرے بھرے کھیتوں کی طرف کھلتی تھی۔ فصلوں کے بعد نئی بنی ہوئی سڑک تھی اور اس کے پیچھے گاؤں والوں کے گھر، اکٹھے، جڑے جڑے، آگے پیچھے بے ترتیب---- نئی سڑک پر اسے اتنی زیادہ تعداد میں بڑی گاڑیاں نظر آئیں تو اس کا دل مچلنے لگا۔ بابا کے خاموش مسکراتے چہرے سے اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اکثر جواب سن کر وہ خاموش تو ہو جاتا لیکن تجسس اس کے چھوٹے سے معصوم دماغ کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ بابا کے جواب دس سالہ معصوم بچے کے لیے ہوتے، لیکن اس کے سوال کسی بڑے آدمی کے سوالوں سے زیادہ بڑے ہوتے تھے۔ جیسے،

''بابا یہ محافظ ہیں تو اتنے طاقتور کیوں نظر آ رہے ہیں؟ سکول کے گارڈ انکل تو سوکھے سے ہیں۔''

''بابا یہ لوگ پہلے کہاں تھے؟''

''یہ آج کتنی دیر رہیں گے؟''

''یہ کل کس وقت آئیں گے؟''

''یہ اس سے پہلے ہمارے گاؤں کیوں نہیں آتے تھے؟'' وغیرہ وغیرہ۔

بابا کبھی تسلی بخش جواب نہیں دے پاتے تھے۔ فصیح کے ماتھے پہ کسی تجربہ کار شخص کی طرح شکنیں رونما ہوتیں اور وہ بابا کے اطمینان سے بے چین ہو کے دوبارہ کمرے میں چلا جاتا۔ اسے پورے گھر میں یہ کھڑکی بہت پسند تھی اور وہ دن کا بیشتر حصہ اس کے سامنے کھڑے ہو کے گاؤں کا وسیع منظر دیکھتے ہوئے گزار دیتا۔ سبز کھیتوں سے لہراتی ہوئی تازہ ہوا کھڑکی سے داخل

احمد اسد اللہ

ہو کے مسلسل اس کے موٹے موٹے گلابی رخساروں پہ گدگداتی تو اس کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

چھٹی والے دن تو وہ خاص اہتمام سے اپنی چھوٹی سی کرسی کھڑکی کے سامنے لے جاتا تھا۔ دراصل چھٹی والے دن نئی سڑک پر لڑکے کرکٹ کھیلتے تھے اور وہ سامنے والی دکان سے لائی ہوئی چیزیں کھاتے ہوئے بڑے شوق سے میچ دیکھا کرتا تھا۔ گھر میں کوئی اس کے پرسکون شب و روز میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ باجی سے دس سال چھوٹا تھا، وہ اسے یوں چاہتیں جیسے وہ انہی کی اولاد ہے۔ کالج کے کیفے سے طرح طرح کی مزے دار چیزیں لا کے اسے دیا کرتیں۔ اسے یوں چومتی رہتیں جیسے وہ ابھی بھی دو سال کا بچہ ہے۔ کبھی کبھی دوسروں کے سامنے یہ لاڈ پیار اسے تھوڑا شرمندہ بھی کرتا لیکن اپنے گھر میں وہ ایک چھوٹے سے بادشاہ کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ ایسا بادشاہ جسے ہر وقت یہ پر مسرت احساس رہتا ہو کہ اس کے اردگرد سب کے سب لوگ اس کے دوست ہیں۔ نہ کوئی دشمن نہ غدار۔ سب پیار کرنے والے باوفا لوگ۔۔۔ امی کبھی اکیلا بیٹھا دیکھ کر غصہ ہوتیں تو بابا اس کی طرفداری کے لیے میدان میں آجاتے۔ باجی کسی شرارت پہ اگر ڈانٹ دیتیں تو تھوڑی ہی دیر بعد جا کے اسے سینے سے لگا لیتیں۔ بابا کو تو کبھی کسی پہ بھی غصہ نہیں آیا تھا، کسی نے کبھی ان کی اونچی آواز تک نہ سنی۔ ایک پرسکون گھرانہ تھا جس میں سب دلی طور پر مطمئن تھے۔۔۔۔

جب پہلی دفعہ بڑی گاڑیاں اس نئی سڑک پہ آ کے ٹھہریں تو فصیح کھڑکی میں ہی کھڑا تھا۔ جب وہ گاڑیاں آ رہی تھیں تو سورج سر پہ تھا۔ جیسے جیسے وہ لوگ شریر بندروں کی طرح گاڑیوں کے پیچھے سے چھلانگیں لگا لگا کے اترنے لگے تو فصیح نے دیکھا کہ سیاہ بادلوں نے چمکتے سورج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سردی بڑھ گئی۔ ہرے بھرے کھیتوں کی چمک زائل ہو گئی۔ فصیح اس اتفاق سے کچھ حیران بھی ہوا کہ جب وہ لوگ واپس گاڑی میں سوار ہونے لگے تو سورج کے سامنے سے گھنے بادل ہٹنے لگے اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد دلکش سنہری کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کے کمرے کی دیوار پہ سونے کا رنگ بکھیرنے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد سورج ہی ڈوب گیا اور وہ کمرے سے باہر آ گیا۔۔۔

اگلے ہفتے بھی کچھ ایسا ہی نظارہ دیکھنے کو تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا بغیر مداری کے یہ بندر تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کی غصیلی آنکھیں مداری تلاش کر رہی تھیں۔۔۔ وہ باہر نکلا اور صحن میں بابا کی کرسی کے ساتھ جا کے کھڑا ہو گیا۔

''بابا؟''

بابا مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''یہ نئی سڑک پر اتنے زیادہ لوگ کیوں آتے ہیں؟''

''بیٹا یہ ہمارے محافظ ہیں۔''

''میں نے پوچھا کیوں آتے ہیں؟'' وہ کچھ چڑ کے بولا۔ بابا پھر سے مسکرانے لگے۔ عینک اتار کے فصیح کو غور سے دیکھا اور بولے،

''ہماری حفاظت کرنے ہی آئے ہوں گے۔ تم اتنا مت الجھو۔ جاؤ جا کے اپنا کھیل کھیلو۔''

''میں کچھ نہیں کھیلتا۔'' اس نے سر جھکا کے دھیمی سی آواز سے کہا۔ ''ہمارے سکول کے گارڈ انکل تو بڑے سوکھے سے ہیں۔ آواز نہیں نکلتی ان بے چاروں کی۔''

بابا بدستور مسکراہٹ لیے اس کی جھکی پلکوں اور معصوم سے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔

''بابا یہ واپس کیوں نہیں جا رہے؟''

''تمہیں کیوں اتنے چبھ رہے ہیں؟'' وہ ہنسی روکتے ہوئے بولے۔

''پہلے تو ایک دو گھنٹے ہی رکتے تھے نا۔ یہ جائیں گے تو موسم ٹھیک ہوگا۔''

''بیٹا موسم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تم جاؤ دیکھو باجی نے چائے بنالی ہے؟'' اور وہ تیوری چڑھا کے اندر کچن میں آ گیا۔۔۔

''باجی پہلے تو یہ لوگ اتنی دیر تک نہیں رکتے تھے۔ اب تو شام ہونے والی ہے۔ کب جائیں گے؟''

''پتا نہیں بیٹا۔'' باجی نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے بے خیالی میں کہہ دیا۔

''اللہ کرے کل تک چلے جائیں۔ کل کرکٹ کا ٹورنامنٹ ہے۔''

باجی مسکرا کے اس کے موٹے موٹے گالوں کو پیار سے دبا کے باہر چلی گئیں۔۔۔ وہ اکیلے سانپ کی طرح بے چینی سے بل کھاتا واپس کمرے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کے شفق دیکھنا چاہتا تھا لیکن ساری توجہ گاڑیوں اور بندوں پہ مرکوز ہو گئی۔

''اب تو آج کا سورج بھی غروب ہو چکا ہے۔ قسم سے ایک کرن بھی آج ہمارے کمرے میں نہیں آئی۔'' اس نے باجی کو دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ گھر میں بڑوں کے چہرے پہ شفیق تبسم اب اسے زہر لگنے لگا تھا۔ جو بات کرو جواب میں مسکرا دیتے ہیں۔۔۔

''بابا مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔'' اس نے کھانے کے میز پر بیٹھتے ہی شکایت کی۔

''سبزی بھی کھانے کے لیے بنتی ہے فصیح۔ آج چپس نہیں ملیں گے۔'' امی نے ذرا سختی سے کہا۔

''اوں ہوں'' وہ امی کی بات سے کچھ تنگ آ کے بولا، ''میں کھانے کی بات نہیں کر رہا بابا۔''

''کیسی الجھن ہے ہمارے پیارے شہزادے کو؟'' اس وقت گھر کی فضا میں غیر معمولی حد تک سکون تھا۔ ایک بڑی بڑی روشن آنکھوں والا معصوم بچہ جو اپنی سوچ کے کسی زاویے سے بھی بچہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ گھر والے جو خدا کی نعمت سے کسی حد تک آگاہ تھے، آنکھوں میں پیار بھر کے اسے مسلسل دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ جو وقتی نہیں لگتی۔ وہ کسی بڑے فلسفی کی طرح میز پر بیٹھا، الجھن، الجھاؤ، اضطراب، بیزاری اور بے چینی جیسے احساسات کا اظہار کر کر کے بڑوں سے سوال کر رہا تھا۔ لیکن اس روز اس کے کسی سوال کا تسلی بخش جواب اسے نہیں مل سکا۔ شیطان کے کان بہرے، وہ بابا کو بھی اپنی طرح مضطرب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر مسلسل طمانیت نے گویا بسیرا ہی جما لیا تھا۔ اگر بابا اتنی سمجھ بوجھ اور پختہ عمر کے باوجود کسی بات سے پریشان نہیں ہوتے تو امی بھی مطمئن تھیں۔ باجی کو تو ان باتوں سے شاید کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اس کی بے چینی کا علاج اسے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ گھر میں کوئی اور بے چین نہیں ہو رہا تھا----

اگلی صبح چھٹی کا دن تھا۔ وہ گھر کے سامنے والی دوکان پہ گیا تو وہاں کالے رنگ کا بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ گردن جھکائے، سلیپر گھسیٹتا ہوا واپس گھر آ گیا۔ کھڑکی کے سامنے گیا تو اسے بے پناہ غصہ آنے لگا۔

''میں کل ہی کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ چلے جائیں تو اچھا ہے۔''

''کیا ہوا بیٹا؟'' باجی اس کے پیچھے کھڑی، کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں اب بھی پتھر کے پہاڑوں کی طرح نئی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

''کرکٹ میچ ہونا تھا نا آج!''

''کوئی بات نہیں کل ہو جائے گا۔'' باجی نے انگلیوں سے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ اگر یہ جانے والے ہوئے۔''

''ہٹ جائیں گے۔''

''آج نہیں ہٹے تو کل کیسے ہٹیں گے؟'' وہ منہ پھلا کے بولا اور باجی اسے پیار کر کے باہر چلی گئیں۔

اٹھتے سیاہ دھویں کی پرچھائیاں آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھیں۔ دوپہر کا سورج تو پہلے سے بادلوں میں چھپا تھا۔ گھروں کے جھرمٹ کے پیچھے سے یہ دھواں اٹھا اور آدھا آسمان سرمئی دکھنے لگا۔ بابا گھر پہ ہوتے تو وہ ضرور بھاگ کے انہیں اپنے کمرے میں بلانے جاتا۔ طرح طرح کے خیالوں سے اس پہ لرزہ طاری ہو گیا۔ کبھی اسے وہ لوگ جلتے ہوئے دکھائی دیتے تو کبھی لوگوں کو جلاتے ہوئے۔ کچھ دیر تو اسے یہ گمان ستانے لگا کہ

گاؤں کے پیچھے سے ایک بگولا چل اٹھا ہے، جو پورے گاؤں کو بھسم کرتا ہوا گزر جائے گا۔ اس کی آنکھیں ثابت بڑی بڑی گاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں کہ مکانوں کے بیچوں بیچ تنگ سی گلی سے ایک لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی سامنے آئی۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی اور دوپٹہ ندارد۔ وہ کھیتوں کو چیرتی ہوئی فصیح کے گھر کے بہت قریب آ گئی۔ وہ کسی پہ مسلسل چیخ رہی تھی۔۔۔۔

شام کو کھانے پر بیٹھا تو بابا نے اسے اس الجھن سے نکالنے کے لیے سب بیان کیا۔ گاؤں کے پیچھے والی سڑک پر ایک ٹی وی چینل والوں کی گاڑی کو آگ لگ گئی تھی۔

''کس نے لگائی؟'' وہ بڑے کڑے لہجے میں بولا، خود کو منصف سمجھتا تھا یا منصف کا نائب!

''کسی نے نہیں لگائی بیٹا، بجلی کے تاروں سے گاڑی الجھ گئی تھی تو آگ پکڑ گئی۔'' بابا کچھ وضاحت سے بولے۔

''مجھے تو ہمسائی نے بتایا کہ جلتے ہوئے سگریٹ سے لگی تھی آگ۔'' امی کچھ پریشان ہو کے بولیں۔

''مقصد تو آگ لگنا تھا۔ جیسے بھی لگی۔''

''فصیح تم کم بولا کرو جب بڑے بات کر رہے ہوں۔'' باجی کو واقعی غصہ آیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

''ڈرائیور اور ایک آدمی جھلس کے مر گئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ رپورٹر نے گاڑی سے بروقت چھلانگ لگا لی تھی، وہ بچ گئی۔'' بابا نے مزید تفصیل بتائی۔ اسے بابا کی باتوں پر یقین آ گیا اور وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی اور وہ کھلی آنکھوں اس چیختی ہوئی زخمی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔

ایک روز شام سے کچھ دیر پہلے بابا چہل قدمی کے لیے باہر جانے لگے تو اس نے پیچھے سے پکارا۔ ''میں بھی جاؤں گا بابا۔''

بابا مسکرائے اور اس کے کندھوں پہ بازو رکھے باہر چلے گئے۔

''اتنی لمبی گاڑیاں۔ اور اتنے لمبے آدمی۔'' وہ نئی سڑک کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آہستہ بولو بیٹا۔''

بابا نے قریب جا کے انہیں سلام کیا تو قریب والے شخص نے کشادہ پیشانی سے جواب دیا۔

''انکل کو سلام کرو بیٹا۔'' فصیح کو اتنے قریب سے یہ لوگ بڑے دہشت ناک لگ رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن وہ اپنا ڈر چھپانے کی کوشش میں تھا۔ بابا البتہ مطمئن تھے۔ ان کے آنے سے انہیں الجھن نہیں تسلی ہوئی تھی۔۔۔

''دیکھا کتنے پیار سے بات کی ہے اس نے۔'' بابا نے گھر میں داخل ہوتے

ہوئے کہا۔

''جی اور جب آپ آگے ہوئے تو بری بری شکلیں بنا کے مجھے ڈرانے لگا تھا۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔ میں نے بھی زبان باہر نکال کے خوب نقل اتاری۔''

بابا اب بھی سلیقے سے مسکرا رہے تھے۔ شاید انہیں اس کی اس بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ فصیح کی باتوں کی تصدیق کرنے والا آنے والے وقت کے سوا کوئی نہ تھا۔۔۔

ایک دھندلی سی شام اس گھر کے چاروں افراد گھر کے سامنے، ہمسائیوں کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ چاروں کی آنکھیں نم تھیں۔ مسکراہٹ ایسے غائب ہوئی کہ شاید کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ بابا نے چشمہ اتارا تو بڑے بڑے، موٹے موٹے آنسو چھلک کے سرخ رخساروں پہ بہنے لگے۔ باجی کا چہرا بھی شفق کی طرح سرخ تھا۔ امی گھونگھٹ نکالے خاموش سسکیوں کو مزید دبانے کی کوشش میں تھیں۔ بابا کے سسکنے کی آواز سنی تو فصیح کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وہ اپنے گھر کے لوگوں سے نظریں ہٹا کے اپنا بندھا ہوا سامان دیکھنے لگا۔ ایک قطار میں سوٹ کیس اور کپڑوں کی بند پوٹلیاں پڑی تھیں۔ اگر اس کے حلق میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو اس وقت وہ بابا سے کئی سوال کرتا کہ اس کے ذہن میں ان کا پر اطمینان لہجہ سوئیاں چبھو رہا تھا۔

''یہ ہمارے محافظ ہیں بیٹا۔''

''حفاظت کرنے ہی آئے ہوں گے۔''

''اب یہاں چور نہیں آئیں گے۔ ڈاکو بھاگ جائیں گے۔''

''تم دیکھنا یہاں کبھی دھماکے سے کوئی نہیں مرے گا۔''

''اب ہمیں اپنے گھروں میں پرسکون نیند میسر آئے گی۔''

فصیح اپنی نم آنکھوں سے ایک بڑی گاڑی کو بالکل ویسے گھور رہا تھا جیسے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ بڑی گاڑی باقیوں سے مختلف اور زیادہ ہیبت ناک تھی۔ سیاہ پتھر کے بڑے پہاڑ کی طرح۔ سورج کے سامنے آئی تو گھر کی دیوار پہ اندھیرا چھا گیا۔ خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی کہ فصیح کے دل پہ خنجر چل رہے تھے۔ سب سے پہلے فصیح کے کمرے کی کھڑکی سے وہ پہاڑ ٹکرایا اور ایسا دھماکا ہوا کہ زمین لرز اٹھی، آسمان تک دھواں سا بلند ہوا۔ نمرود کا تیر آسمان تک تو نہیں پہنچا تھا، لیکن وہ رنگ لایا۔ یہ دھول بھی آسمان تک نہیں پہنچی۔۔۔ بابا نے اس دھماکے کے فوراً بعد فصیح کو زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ہر گرتی دیوار کے شور سے دہشت زدہ ہو کر وہ اسے اور زور سے اپنے سینے میں دبا لیتے۔ اس آس پہ کہ یوں وہ اسے محفوظ رکھ سکیں گے۔۔۔

☆☆☆☆☆

روشنی

سلمان یوسف سمیجہ

"آج کچھ اُداس سے لگ رہے ہو"۔ تنویر کی بات پر وہ چونک اُٹھا۔

"ہاں مگر..... تمہیں کیسے پتہ چلا؟ "وہ حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"میری آنکھیں نہیں ہیں، میں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر میں تمہاری اُداسی دیکھ سکتا ہوں، محسوس کرسکتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارا جگری دوست ہوں جگر!" وہ ایک ہی انداز میں بیٹھا ہولے ہولے سے کہہ رہا تھا۔

تنویر کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے تنویر!" وہ پھر سے کہنے لگا: "خاموشی بھی بولتی ہے، خاموشی بھی زبان رکھتی ہے، خاموشی سب کچھ بتا دیتی ہے۔

تمہاری خاموشی نے بھی سب کچھ اُگل دیا ہے، تم پریشان ہو۔ جگر! میں محسوس کرسکتا ہوں"۔ اس کی باتوں پر تنویر کو خود پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ وہ اس کا دوست ہے!

"ہاں اُداس ہوں میرے دوست!" تنویر کے لہجے اور آنکھوں میں نمی سی پیدا ہوگئی۔

"کس بات پر اُداس ہو تنویر؟" اُس نے

میٹھے لہجے میں پوچھا۔

"پہلے تم وعدہ کرو کہ تم اُداس نہیں ہوگے میری بات سُن کر"۔ تنویر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تم پہلے مجھے بتاؤ یار!" اس نے کہا۔

"یار وہ.....!" تنویر مناسب الفاظ سوچنے لگا۔

"کیا وہ.....!" اس نے تنویر والے انداز میں کہا۔

"مجھے کینسر ہے"۔ تنویر کے منہ سے نکلے یہ الفاظ اس کے کانوں میں بم بن کر پھٹے تھے۔

"مذاق مت کرو تنویر!" اس نے اپنی بے یقینی والے انداز میں کہا۔

"مذاق نہیں کر رہا دوست، مجھے واقعی کینسر ہے۔ آج اماں کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا نا تو ڈاکٹر نے یہی بتایا، اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ اماں رو رو کر ہلکان ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آج کام پر نہیں آئیں۔ ابا کی وفات کے بعد اماں نے مجھے جن حالات میں پالا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں تو پڑھ لکھ کر، کچھ بن کر اماں کو سکھ دینا چاہتا تھا، مگر میں انہیں دُکھ دے رہا ہوں۔ جلد ہی مر جاؤں گا میں۔ اماں کو سہارا نہیں دے سکوں گا"۔ ایک ہی سانس میں کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"یہ نہیں ہوسکتا"۔ تنویر کی بات سن کر وہ بے یقینی سے بولا۔

"یہ ہو چکا ہے دوست!" تنویر روتے ہوئے بولا۔

تنویر کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

"یہ ہو چکا ہے، مگر سب ٹھیک بھی ہوسکتا ہے، ہم تمہارا مہنگے سے مہنگا علاج کروائیں گے، تمہیں بچالیں گے"۔ وہ تنویر کو یقین دلانے والے انداز میں بولا۔

"تنویر بیٹا!" سمیرا بیگم اندر داخل ہو کر بولیں۔ نوکرانی کے بیٹے ہونے کے باوجود بھی سمیرا بیگم تنویر کو اپنا بیٹا کہتی اور مانتی تھیں۔

"بیٹا! تمہاری امی بہت رو رہی ہیں۔ میں نے بہت چپ کروایا، مگر وہ مسلسل روئے جا رہی ہیں۔ تم جا کر چپ کرواؤ بیٹا!" سمیرا بیگم بولیں۔

"جی میں جاتا ہوں"۔ تنویر فوراً اُٹھ کر چل دیا۔

"امی، کیا تنویر کا علاج نہیں ہوسکتا؟ وہ میرا دوست ہے، میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اس کے سوا میرا اور کوء دوست نہیں"۔ وہ اپنی امی سے بھیگے لہجے میں بولا۔

"اسامہ بیٹا! ہم تنویر کا علاج کروائیں

گے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا"۔ سمیرا بیگم اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔

****

اسامہ پیدائشی نابینا تھا، اس نقص کے باعث اس سے کوئی دوستی کرنا پسند نہیں کرتا تھا، حالانکہ اس کیا پنے سگے بہن بھائی بھی نہیں! وہ بے چارہ بغیر دوست کے اداس رہتا۔

ایسے میں تہمینہ خاتون کو جب اس بڑے سے بنگلے میں نوکری ملی تو اس کے اکلوتے بیٹے تنویر نے اسامہ سے دوستی کرلی۔ اب دونوں دوست خوب گپ شپ کرتے، تنویر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باغیچے میں لے جاتا۔ دونوں کی خوب بنتی تھی۔

ایک دن تنویر کی طبیعت خراب ہوئی تو تہمینہ خاتون اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ کینسر میں مبتلا ہوگیا ہے!

****

"میں خود تو نہیں بچ سکتا لیکن میں اسامہ کی زندگی مزید اندھیر نہیں ہونے دوں گا، مرتے مرتے اس کی زندگی میں روشنی ہی روشنی بھر دوں گا، اس کو روشنی کے روشناس کراؤں گا، اسے روشنی کا تحفہ دوں گا!" یہ سوچتے ہوئے تنویر کی آنکھوں میں روشنی سی چمکی۔

****

اس کا بہت علاج کروایا گیا، لیکن اسے نصیب میں موت لکھ دی گئی تھی۔ مرتے مرتے اس نے ڈاکٹر سے کچھ کہا تھا، جس پر فوری طور پر عمل کیا گیا۔ بعد میں اس نے اپنی جان موت کے فرشتے کے حوالے کردی۔

****

اسامہ کی آنکھوں سے پٹیاں اُتاری گئیں تو اس نے پہلی بار دُنیا دیکھی، اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب روشنی تھی، اس کی پوری دنیا روشن ہوگئی تھی۔

"اسامہ بیٹا! تنویر دنیا سے جاتے جاتے اپنی آنکھیں تمہارے لیے چھوڑ گیا تھا، اب کامیاب آپریشن کے بعد تنویر کی آنکھیں تمہاری آنکھوں پر لگ چکی ہیں۔ تنویر تمہارا بہت اچھا دوست تھا۔ دنیا سے منہ موڑتے ہوئے بھی وہ تمہارے لیے اچھا کام کرگیا، تمہیں روشنی دے گیا"۔ سمیرا بیگم خوشی سے بھرے لہجے میں اسامہ کو بتایا۔

واقعی دوست ہو تو تنویر جیسا! اسامہ کی آنکھوں سے ننھے قطرے بہنے لگے۔

یہ دراصل تنویر کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے!

☆☆☆☆☆

فیصلہ [مائیکرو فکشن]

ایک گھنٹے کو گزرے پورا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور پورے ایک گھنٹے سے وہ اس منظر کو تکے جا رہا تھا وہ منظر جو سامنے تھا کالے گہرے بادلوں سے گرتا کالا رس اور زمین پر جل تھل کالا سیال بہتا منظر وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا ہاں وہاں سناٹا تھا جو اس منظر سے نکل کر اس کے بدن میں سرائیت کر چکا تھا اسی منظر میں وہاں دور ایک قدرے جھکا ہوا برگد کا درخت تھا جو صدیاں اندر اتارے بوجھ سے لدا سسکیاں لیتا محسوس ہو رہا تھا اس نے غور سے دیکھا تو اس کی جڑوں میں کچھ سانپ پھن پھیلائے کھڑے تھے جیسے وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو لیکن پاس ہی ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ اس سارے منظر میں حیران کن تھا جس کی آنکھیں زندہ تھیں ......اس سارے منظر میں صرف وہ ہی زندہ تھیں وہ زندہ آنکھیں لیکن ... لیکن یہ کیا بہت زیادہ غور پر یہ اس کا بات اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ آنکھیں زندہ تھیں بھی یا نہیں ... لیکن آنکھیں تو جاگ رہی تھیں ......کیسے؟ یہ طے کرنا مشکل تھا۔

یہ سارا منظر ایک دریا کنارے کا تھا اس دریا میں بہتا سیال کالا گاڑھا، پانی نما اس پورے منظر کو اور ہیبت ناک بنا رہا تھا اس نے غور کیا تو دریا رکا ہوا تھا اور اس کی سطح سیال پر سرخ کائی کی دبیز تہہ میں کوئی ننھی منی مخلوق رینگ رہی تھی جن پر انسان ہونے کا گمان ضرور ہوتا اگر ان سب کے ہاتھوں میں امن کا پرچم نہ ہوتا...وہ شاید اس جزیرے کی مخلوق تھی.. وہ اس منظر کو گھنٹوں تلک دیکھتا رہا..اب اس کی پیاس شدید ہو رہی تھی ....آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا اور ایک لاکھ ڈالرز میں وہ پینٹنگ خرید لی۔

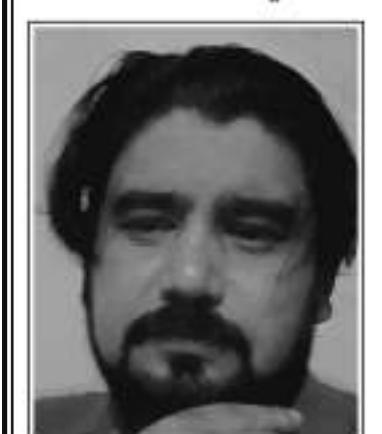

سید تحسین گیلانی

تین خط اور ایک فٹ نوٹ

ترجمہ: فرحت پروین

جناب!

میں آپ کو یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں اور اُمید رکھتی ہوں کہ آپ اتنی مہربانی ضرور کریں گے کہ انھیں اپنے نام سے شائع کرا دیں۔ میں نے آپ سے یہ درخواست اس لیے کی ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں اپنے نام سے بھیجوں تو اِسے کوئی بھی اخبار شائع نہیں کرے گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اِسکا انداز مردانہ بنانے کے لیے اِس میں مناسب ردوبدل کرلیں، جس سے یہ تحریر یقیناً زیادہ بہتر ہوجائے گی۔

اپنے کام پر جانے کے لیے مجھے لازمی طور پر دن میں دوبار سٹریٹ کار لینی پڑتی ہے اور پچھلے پانچ سال سے میں اسی طرح آجا رہی ہوں۔ واپسی میں کبھی کبھار میری چند دوست لڑکیاں ساتھ ہوتی ہیں مگر جاتے ہوئے ہمیں ہمیشہ اکیلی ہوتی ہوں۔ میری عمر بیس سال ہے۔ میں دراز قد ہوں اور زیادہ دُبلی نہیں ہوں اور میرا رنگ بھی گہرا نہیں ہے۔ میرا دہانہ قدرے بڑا ہے مگر ہونٹ زرد نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے میری آنکھیں چھوٹی نہیں ہیں۔ یقیناً آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ میں نے اپنے سراپے

کا ذکر بڑے انکسار سے کیا ہے۔ لیکن یہ کم از کم ایسا ضرور ہے کہ کئی آدمیوں کو متوجہ کر سکے بلکہ میرا کہنے کو دل چاہ رہا ہے..... تمام آدمیوں کو۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آپ مردوں کی عادت ہے کہ سٹریٹ کار میں سوار ہونے سے پہلے آپ کھڑکی میں سے بڑے غور سے سب سواریوں کو دیکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ تمام چہروں کا معائنہ کر لیتے ہیں (خصوصاً عورتوں کے، کیونکہ ظاہر ہے آپکو صرف انہی سے دلچسپی ہوتی ہے) اس چھوٹی سی تقریب کے بعد آپ اندر داخل ہوتے ہیں۔ اور بیٹھ جاتے ہیں۔

چلو خیر، جیسے ہی کوئی آدمی فٹ پاتھ سے اُتر کر کار کی طرف بڑھتا ہے اور اندر نظر ڈالتا ہے۔ میں اُسے دیکھتے ہی خوب اچھی طرح جان جاتی ہوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے اور اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سنجیدہ مزاج انسان ہے اور اپنے دس سینٹ کرائے کے صرفے سے ایک آرام دہ سواری چاہتا ہے۔ میں بہت جلد اُن میں فرق محسوس کر لیتی ہوں جو آرام و سہولت کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ جو کسی لڑکی کے پہلو میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں چاہے کتنی ہی کم جگہ کیوں نہ ہو۔

جب میرے پاس جگہ خالی پڑی ہوتی ہے تو میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہی ایک نظر میں پہچان لیتی ہوں کہ کونسے آدمی خشک مزاج اور بے نیاز قسم کے ہیں جو کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔ کونسے ایسے ہیں جنھیں تھوڑی بہت دلچسپی ہو گی اور بیٹھ جانے کے بعد سر موڑ کر لگاوٹ کی ایک نظر ہم پر ڈال لیں گے اور آخر میں وہ لوگ آتے ہیں۔ اصل منچلے لوگ، جو سات خالی سیٹیں چھوڑ کر کار کے بالکل آخر میں بے آرام تھوڑی سی تنگ جگہ کے باوجود میرے پہلو میں بیٹھنے کے لیے وہاں تک پہنچیں گے۔

میرے خیال میں یہ لوگ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ عام طور پر جو لڑکیاں اکیلی سفر کرتی ہیں وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور نئے آنے والے کو جگہ پیش کرتی ہیں۔ اُنکے برعکس میں بیٹھی رہتی ہوں اور مہم جو منچلے کی آمد پر خود کھڑکی کی طرف سرک کر اُسکے لیے بہت سی جگہ خالی کر دیتی ہوں۔

'بہت سی جگہ' یہ ایک بے معنی جملہ ہے۔ ایک لڑکی کی اپنے پڑوسی مسافر کے لیے چھوڑی ہوئی تین چوتھائی سیٹ بھی کبھی کافی نہیں ہوتی۔ ہل جُل کر اپنی مرضی کے مطابق بیٹھنے کے بعد وہ حیرت انگیز طور پر ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس حد تک گویا انھیں فالج ہو گیا ہو۔

لیکن ایسا صرف بظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس انجماد، اس بے حس و حرکت انداز کو بنظرِ تشکیک دیکھے تو وہ اس بات کو نوٹ کرلے گا کہ غیر محسوس طریقے سے بڑی ہوشیاری و چالاکی سے، جس کی اُنکے چہرے کا غائب دماغی اور بے نیازی کا تاثر مزید پردہ پوشی کرتا ہے۔ اُس شریف آدمی کا جسم آہستہ آہستہ یوں کھڑکی کی طرف سرک رہا ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی ایسی سطح پر بیٹھا ہے جس کا جھکاؤ کھڑکی کی طرف ہے جہاں کی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ نہ اُسے دیکھ رہا ہوتا ہے اور نہ ہی بظاہر اُسے اس سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔

کچھ لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر کوئی بھی قسم کھانے کو تیار ہو جائے کہ یہ کسی دور دراز کی سوچ میں ہیں۔ مثلاً چاند کے متعلق، بہرحال اس دوران اُنکا دایاں پاؤں (یا پھر بایاں) آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے اُس سطح پر پھسلتا چلا جاتا ہے جسکا ابھی ذکر کیا گیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ جب سارا سلسلہ چل رہا ہوتا ہے تو میں اس سے ذرا بھی اُکتا نہیں رہی ہوتی۔ جب میں کھڑکی کی طرف کھسکتی ہوں تو ایک سرسری نظر میں ہی اُس حسن پرست دل پھینک کے متعلق اندازہ لگا لیتی ہوں کہ آیا وہ زندہ دل جوشیلا شخص ہے جو اپنے اندر کی پہلی ہی تحریک پر پیش قدمی کرتا ہے یا کوئی ایسا پختہ کار جو مجھے پریشان کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آیا وہ بامروت نوجوان ہے یا محض گھٹیا شخص۔ کیا پکا مجرم ہے یا معمولی جیب کترا۔ کیا وہ سچ مچ پُرکشش بانکا رومیل ہے۔

یا معمولی سی چھیلا، جس پر بزعمِ خویش عورتیں مرتی ہیں۔

پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف ایک مخصوص قسم کے آدمی اس طرح کی حرکت کریں گے اپنے چہرے پر ایک منافقانہ ماسک چڑھائے اپنا پاؤں چالاکی سے سرکاتے جائیں گے۔ بظاہر چور اُچکے۔ مگر یہ ایسا ہے نہیں اور کوئی بھی ایسی لڑکی نہیں ہے جس نے اس چیز کا مشاہدہ نہ کیا ہو۔ سو ہر مختلف قسم کے مرد کے لیے وہ ایک خاص مختلف دماغ کا طریقہ تیار رکھتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھار اگر لڑکا نوعمر ہو یا گھٹیا لباس پہن رکھا ہو تو وہ عموماً جیب کترا ہوتا ہے۔

سارے مرد جو حربے استعمال کرتے ہیں وہ عموماً ایک سے ہوتے ہیں (پہلا مرحلہ) سب سے پہلے اچانک سختی اور ایسا تاثر گویا چاند کے متعلق سوچا جا رہا ہے (دوسرا مرحلہ) ہم پر اک اُچٹتی سی نظر جو ذرا سی دیر، ہمارے چہرے پر ٹھہرتی ہے لیکن جس کا اصل مقصد اس فاصلے کا اندازہ لگانا ہوتا ہے جو اُس کے پاؤں

اور ہمارے پاؤں کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد تسخیر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ میرے خیال میں صرف چند ہی اور چیزیں اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ جب تم مرد پاؤں کی اس نقل و حرکت پر عمل کرتے ہو۔ جب تم پنجے اور ایڑی کی متبادل حرکت سے آہستہ آہستہ پاؤں آگے بڑھاتے ہو۔ بلاشبہ تم مرد اپنی اس مضحکہ خیز حالت کو دیکھ نہیں سکتے مگر بلی چوہے کے اس خوبصورت کھیل میں ایک طرف سائز گیارہ کا جوتا ہوتا ہے اور دوسری طرف چھت کے قریب اک تمتماتا ہوا احمقانہ چہرہ (بلاشبہ شدت جذبات)۔ اس حرکت کا اس کا اُن تمام عجیب و غریب حرکتوں سے کوئی بھی مقابلہ نہیں جو تم مرد کرتے ہو۔

میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں اس تماشے سے بالکل نہیں اکتاتی بلکہ یہ میرے لیے باعثِ تفریح ہوتا ہے اس لمحے سے جب تسخیر کرنے والا مکمل طور پر اُس فاصلے کا اندازہ کر لیتا ہے جو اُسے اپنے پاؤں سے طے کرنا ہتا ہے۔ وہ کم ہی پھر اپنی نظر کو دوبارہ بھٹکنے دیتا ہے۔ اُسے اپنی پیمائش پر یقین ہوتا ہے اور اُس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ بار بار دیکھ کر ہمیں چوکنا کر دے۔ آپ یقیناً یہ تو تسلیم کر لیں گے کہ یہ کشش ہم سے قریب ہونے میں ہوتی ہے صرف دیکھنے میں نہیں۔

جب یہ منچلا ہمسایہ آدھا فاصلہ طے کر لیتا ہے تو میں بھی وہی نقل و حرکت شروع کر دیتی ہوں اور اُتنی ہی عیاری سے۔ اُسی طرح غائب دماغی اور سوچ کا تاثر دیتے ہوئے۔ مثلاً اپنی گڑیا کے متعلق سوچتے ہوئے۔ صرف میرے پاؤں کی حرکت اُس سے دور ہونے کی ہوتی ہے۔ زیادہ نہیں۔ صرف چند انچ ہی کافی ہوتے ہیں۔

اُس وقت اپنے ہمسائے کی حیرت کیا بتاؤں کیا لطف دیتی ہے۔ جب اپنے اندازے کے مطابق فاصلہ کرنے کے بعد کسی بھی چیز کے قریب نہیں پہنچ پاتا۔ اُس کا گیارہ نمبر کا جوتا یکہ و تنہا ہوتا ہے۔ اُس کی حیرت اور مایوسی دیدنی ہوتی ہے۔ وہ پہلے ایک نظر فرش کی طرف دیکھتا ہے اور پھر میرے چہرے کی طرف۔ وہاں اب بھی وہی تاثر ہوتا ہے۔ جیسے میری سوچ ہزاروں میل دور بھٹک رہی ہو یا میں خیالوں میں اپنی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔ لیکن بات اُس شخص کی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ سترہ میں سے پندرہ مرتبہ (میں یہ تعداد بڑے لمبے عرصے کے تجربات کے بعد بتا رہی ہوں) چڑا ہوا معزز آدمی اپنی اُمنگ سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ باقی کے دو کیسوں میں مَیں اُسے تنبیہی

نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس نگاہ سے بے عزتی، ذلت یا غصے کے تاثرات کا اظہار کیا جائے۔ بس اس کی طرف صرف سر کو موڑنا ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کیسوں میں ایک ایسے آدمی سے نظر نہ ملانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ جو اتفاق سے حقیقتاً بہت بری طرح ہمارے لیے کشش محسوس کر رہا ہے۔ کسی بھی جیب کترے میں ایک خطرناک چور بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے وہ خزانچی بخوبی آگاہ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی رقموں کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ جوان عورتیں بھی جو نہ بہت دُبلی ہوتی اور نہ ہی جنکا رنگ گہرا ہوتا ہے اور جنکے دہانے تنگ اور آنکھیں چھوٹی نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ میرا معاملہ ہے

آپکی مخلص
ایم۔ آر

ڈیئر مس!

میں آپ کی عنایت کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں اس مقالے کے جو آپ کے تاثرات پر مبنی ہے۔ بڑی خوشی سے اپنے نام سے شائع کرانے کو تیار ہوں۔ جیسا کہ آپ نے درخواست کی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے چند باتوں کے بارے میں آپ کے تاثرات و خیالات جاننے کا شدید اشتیاق ہے۔ بطور آپ کے مددگار کے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جواب جاننا چاہوں گا۔ ان سترہ اصلی کیسوں کے علاوہ جنکا آپ نے ذکر کیا ہے۔ کیا کبھی آپ کو بھی اپنے ہمسائے کے لیے کشش محسوس ہوئی؟ چاہے وہ خفیف ترین ہو۔ ہو۔ دراز قد یا کوتاہ قد۔ بلانڈ یا سانولا۔ مضبوط یا دُبلا، کیا آپکو بھی کبھی پیش قدمی کی بے نام سی خواہش محسوس ہوئی۔ چاہے وہ اتنی ہی معمولی ہو کہ آپ کا اپنا پاؤں ہٹانے کو دل نہ چاہے اور ایسا کرنا تکلیف دہ محسوس ہو۔

ایچ۔ کیو

جناب!

سچ تو یہ ہے کہ "ہاں"۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک بار ایسا محسوس ہوا۔ مجھے کسی کی طرف پیش قدمی کی خواہش محسوس ہوئی، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میرے پاؤں سے وہ قوت ہی سلب ہوگئی جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا تھا۔ اور وہ شخص آپ تھے۔ مگر آپ میں اُس سے فائدہ اُٹھانے کا شعور ہی نہیں تھا۔

ایم۔ آر

☆☆☆☆☆

غزل

شرط ہے حسنِ نظر، زہرہ جبیں ہوتے ہیں
اس ترے شہر میں انسان حسیں ہوتے ہیں

اس طرح میل ملاقات کہاں ہے ممکن
ہم رہیں اور کہیں آپ کہیں ہوتے ہیں

غم کے اشعار میں موضوعِ سخن ہو جیسا
آپ جس نظم میں ہوں ہم بھی وہیں ہوتے ہیں

شعر محتاط قرینے سے پڑھے جائیں گے
بزم احباب میں کچھ پردہ نشیں ہوتے ہیں

دل سے احساس کی شدت کو سمجھنے والے
شعر میں لفظ کی عزت کے امیں ہوتے ہیں

آسمانوں کا یہاں ذکر کہاں تک ہو گا
آپ کے پاس تو ہم اہلِ زمیں ہوتے ہیں

جسم زخمی ہے شراروں سے نکل کر ثاقبؔ
ہم کسی باغ کے پھولوں میں مکیں ہوتے ہیں

آصف ثاقب

غزل

ہم نے شوق آنکھوں کے، طاق ہی میں رکھے ہیں
چن کے پھول نرگس کے، ٹوکری میں رکھے ہیں

آتشی تماشے سے ، سسکیاں بکھرتی ہیں
درد کے شرر پارے ، پھلجھڑی میں رکھے ہیں

تیری بادشاہی کے ، کیا عجب طریقے ہیں
سارے گُر حکومت کے اک چھڑی میں رکھے ہیں

پرشکستہ ہیں پھر بھی ، ہم نے آسمانوں پر
حوصلے اڑانوں کے ، بے پری میں رکھے ہیں

آپ کا ہے فرمانا ، مانتے ہیں یہ کہنا
دوستی کے پیرائے ، دشمنی میں رکھے ہیں

آ گیا ہوں کس دل سے ، جانتا ہے دل میرا
میرے دل کے ٹکڑے سب اُس گلی میں رکھے ہیں

ان کے ساز سے ثاقبؔ ، عشق سوز والا ہے
دل کے ساز عاشق نے ، بانسری میں رکھے ہیں

آصف ثاقب

غزل

وقت بدلنے والا تھا
رُک جاتے تو اچھا تھا

سب ہی جاگتے رہتے تھے
سب کو سب سے خطرا تھا

نسلیں، جس میں ڈوب گئیں
کیسا قاتل نشہ تھا

ہاتھ ہے اب تک اُلجھن میں
چھوٹا تھا یا چھوڑا تھا؟

لفظ تھا کیا جو آدم نے
سب سے پہلے بولا تھا

اِس سے آگے، یاد نہیں
میں نے اُس کو دیکھا تھا

حدِ نظر کے رستے میں
حدِ نظر ہی پردا تھا

راہی تھے سب نئے نئے
رستہ، دیکھا دیکھا تھا

پوچھ رہے تھے سب کردار
کس نے اُن کو رکھا تھا

کس کس کی ہم بات کریں
سب کچھ ایک معما تھا

رستہ اب تک ہے مبہوت
کون، یہاں سے گزرا تھا

جب تک تھی وہ بزم، رواں
وقت وہیں پر ٹھہرا تھا

بھیڑ تھی ایسی خلقت کی
جیسے دل اک رستا تھا

پُل تھا خالی دور تلک
دریا، اُترا اُترا تھا

ہم نے دل کی بات سنی
ورنہ سب نے روکا تھا

رات نہیں تھی پہلی سی
ایک ہی تارا ٹوٹا تھا

امجد اسلام امجد

کیسے ہجر سے بچ پائے
قصّے کا وہ حصّہ تھا

اُس تارے کی بات کرو
پلکوں پر جو لرزا تھا

ایک ہی سب کی منزل تھی
رستہ ، اپنا اپنا تھا

دھیان نہیں تھا میری اَور
حال تو اُس نے پوچھا تھا

وعدہ تھا یا کانچ کا پُل
ایک ہی پَل میں ٹوٹا تھا

ہم اور تُم تھے بیچ کھڑے
چاروں جانب صحرا تھا

کیسے لوٹ سکا وہ پَل
ابھی ابھی جو بیتا تھا

دل جو نہیں تھا وعدے میں
امجدؔ ، یہ تو ہونا تھا

غزل

اب تو اپنے جسم کا سایہ بھی بیگانہ ہوا
میں تری محفل میں آ کر اور بھی تنہا ہوا

وقفِ دردِ جاں ہوا، محوِ غمِ دنیا ہوا
دل عجب شے ہے کبھی قطرہ کبھی دریا ہوا

تیری آہٹ کے تعاقب میں ہوں صدیوں سے رواں
راستوں کے پیچ و خم میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

لذتِ دیدار کی اے ساعتِ رخشاں ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں، ترے چہرے پہ کچھ لکھا ہوا

اب تو تیرے حسن کی ہر انجمن میں دُھوم ہے
جس نے میرا حال دیکھا، تیرا دیوانہ ہوا

تیری آنکھوں پر نظر پڑتے ہی میں گم ہو گیا
کچھ سمجھ آتا نہیں مجھ کو، کہ مجھ کو کیا ہوا

ہر حسیں میں روشنی تیرے گُلِ عارض کی ہے
ہر حسیں لگتا ہے پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا

حسن کے سیلاب نے گھیرا ہے سارے شہر کو
ایک رستہ بھی نظر آتا نہیں بچتا ہوا

وہ سنے رخصت ہوئے ہمدم! وہ شامیں کھو گئیں
کن خیالوں کے جھمیلوں میں ہے تو الجھا ہوا

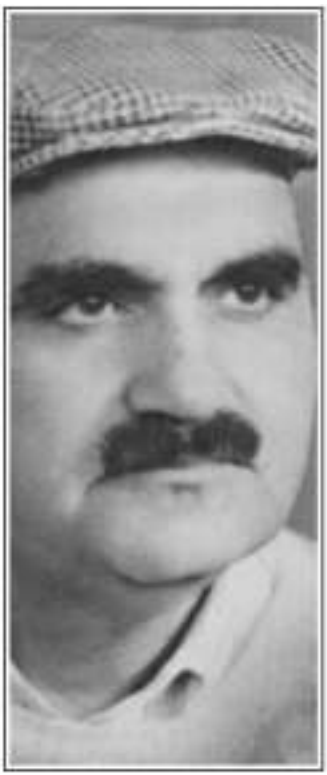

جمیل یوسف

غزل

ہم اپنے اپنے بیانیوں کے اسیر انساں
جو ہٹ کے سوچے اسے شماریں حقیر انساں

تو خود کو بھی اس میں کر کے شامل یہ پوچھتے ہیں
کہیں کوئی ہے کہیں جسے باضمیر انساں

طباقِ دل ریزۂ محبت سے بھی تہی ہے
مگر جہاں بھر کی خواہشوں کا امیر انساں

امیر و مفلس کے فرق سے بھی غمیں ہوں لیکن
تلاشتا ہوں میں کوئی دل کا فقیر انساں

جئے محبت تو چاند سورج بھی حیرتی ہوں
ستم پہ آجائے تو بھی کر دے اخیر انساں

کب اس کو پروا کہ کون سینوں اتر رہے ہیں
کمانِ لب سے چلائے جاتا ہے تیر انساں

چھپائے پھرتا ہے خود کو رنگیں لباسیوں میں
سمے نے اندر سے کر دیا لیر و لیر انساں

خود اپنے اندر اتر کے دیکھیں تو جان پائیں
کہ ایک انسان میں ہیں کتنے کثیر انساں

کدھر شعور و جنوں میں اقبال سا توازن
کہاں طلگارِ غم کوئی مثلِ میر، انساں

جلیل عالی

غزل [خالد احمد کی نذر]

بیاضِ فکر میں یا عرصۂ ہنر میں رہا
مثالِ آئینہ دل میں کہ چشمِ تر میں رہا

وہ لحہ لحہ رہا مضطرب خدا جانے
کہاں سکوں سے کسی سایۂ شجر میں رہا

بجا کہ اس کا ہر اک لفظ نم گرفتہ ہے
مری نظر میں وہ تشبیب کے اثر میں رہا

ہدف تھا گردشِ لیل و نہار کا ہر دم
ثباتِ عزم کا پیکر جو خود سفر میں رہا

اسے عزیز تھے لاہور کے گلی کوچے
گریباں چاک ٹھہر کر نہ اپنے گھر میں رہا

خلوصِ دل سے وہ سوغات بانٹتا اس کا
کہ اس کے پیار کا قصہ بھی ہر خبر میں رہا

قدم قدم پہ تھا خالد سخن وروں کا رفیق
وہ دل فگار حسنؔ ان کی رہگزر میں رہا

حسن عسکری کاظمی

غزل

جب کوئی حرف اعتراف لکھا
اِک قرینے سے اختلاف لکھا

مَیں روانہ ہوا جو سُوئے حَرم
اُس مسافت کو بھی طواف لکھا

کچھ چھپایا نہیں ہے دنیا سے
جو ہوا مجھ پہ انکشاف ، لکھا

دل میں تھا جو بھی ، لِکھ دیا سب کچھ
میں نے جب عین شین قاف لکھا

سجدہ کرتے ہوئے مصلّے پر
رب کی عظمت کا اعتراف لکھا

خوب تحقیق کر چکا جب مَیں
جسم کو روح کا غلاف لکھا

جب طریقت کا زاویہ بدلا
میں نے اِک حرف انحراف لکھا

جب بھی لکھا ہے خط اُسے میں نے
دل کا احوال صاف صاف لکھا

میں نے قاتل کے نام خط میں نسیم
جا ، تجھے بھی کیا معاف ، لکھا

نسیمِ سحر

غزل

اپنے محور سے نکلنے نہیں دیتا مجھ کو
اور ہمراہ بھی چلنے نہیں دیتا مجھ کو

یہ بھی کہتا ہے کہ آنکھیں کھلی رکھوں اپنی
اور پھر سچ بھی اگلنے نہیں دیتا مجھ کو

میں سُلگتا، دھواں دیتا رہوں، یہ چاہتا ہے
جلنے لگتا ہوں تو جلنے نہیں دیتا مجھ کو

میں کہاں جاؤں خدایا؟ یہ زمانہ تیرا
رزقِ طیب پہ تو پلنے نہیں دیتا مجھ کو

تیری آواز تو آتی ہے مرے کانوں میں
تیرے سانچے میں وہ ڈھلنے نہیں دیتا مجھ کو

سونے چاندی کے پہاڑوں پہ کھڑا ہوں لیکن
یہ سہارا بھی سنبھلنے نہیں دیتا مجھ کو

تیرے دیکھے سے ہواؤں میں اُڑا کرتا تھا
اب تیرا جلوہ مچلنے نہیں دیتا مجھ کو

مرے اندر ہی چھپا ہو گا کہیں جانِ انیس!
جو کسی طور بدلنے نہیں دیتا مجھ کو

محمد انیس انصاری

غزل

دماغوں سے ابھی تک سوچ تاتاری نہیں نکلی
مہذب ہو کے بھی اندر کی خونخواری نہیں نکلی

بدل ڈالے سبھی قانون اک اک کر کے جنگل کے
شفا تو مل گئی پر جڑ سے بیماری نہیں نکلی

شہنشاہیتیں تو گئیں دربار سے باہر
مگر درباریوں کی خوئے درباری نہیں نکلی

جتن کر کے نکالا ہر ہوائے خبث باطن کو
ہوس نکلی پہ آنکھوں سے ہوس کاری نہیں نکلی

شعوری طور پر انسانیت تو آ گئی لیکن
عقوبت خانۂ دل سے دل آزاری نہیں نکلی

گدھے کو باپ تک بھی کہہ دیا اہلِ تصرف نے
مگر اندر سے انسانوں کے خرکاری نہیں نکلی

بہت ضربیں لگائیں ہر بت نفرت کو نفرت کی
مگر ان میں کوئی اک ضرب بھی کاری نہیں نکلی

نکالا تو بہت کچھ ہم نے پچھلی ساٹھ صدیوں میں
نہیں نکلی تو عیاری و مکاری نہیں نکلی

اگرچہ مانتے ہیں سب گلوبل گاؤں دنیا کو
مگر نقشے سے اب بھی چار دیواری نہیں نکلی

دیارِ غرب والو! لاٹری امن و محبت کی
تمھاری بھی نہیں نکلی ہماری بھی نہیں نکلی

انعام الحق جاوید

غزلیں

زمیں کی خاک ہو کر بھی چلن ہیں کہکشاں والے
مجھے حیرت سے دیکھے جا رہے ہیں آسماں والے

اِک آنسو نے بیاں کر دی ہے ساری داستانِ دل
ہماری بے زبانی پر تصدق ہیں زباں والے

کسے نام آوری کا دعویٰ ہو سکتا ہے دُنیا میں
پڑے ہیں بے نشاں کتنے یہاں نام و نشاں والے

فرشتوں کے توسط سے حسابِ زندگی یارب!
مرے حاسد نہ ہو جائیں کہیں یہ درمیاں والے

مبارک ہو، یہ رسمِ دوستی پوری ہُوئی خاورؔ
قفس تک چھوڑنے آئے تمہیں سب آشیاں والے

خاور اعجاز

روشن چراغِ قلبِ فسردہ کہاں سے ہو
سچ پوچھیے یہ کام تو چشمِ بتاں سے ہو

دیکھے ہُوئے ہیں ہم نے فلک در فلک بہت
ہو گے مَلک مگر کہو کس آسماں سے ہو

دعوائے قربِ یار و حضوری بجا سہی
لیکن یہ کیا کہ سہمے ہُوئے امتحاں سے ہو

کس منہ سے آئیں ہم ترے در پر، گِلے کے بعد
تیرے کرم کا شکر ادا کس زباں سے ہو

خاورؔ بہار کو تو گزارو سکون سے
کیوں زرد رُو ابھی سے ہی فکرِ خزاں سے ہو

غزل

جب سے چرچا ہے تری انجمن آرائی کا
کون مشتاق نہیں تجھ سے شناسائی کا

بچ کے جائے کوئی تجھ سے یہ کہاں ممکن ہے
کھینچ لیتا ہے کرشمہ تری زیبائی کا

بے نیازی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے
امتحان اور نہ لے صبر و شکیبائی کا

تجھ سے مایوس نہ ہو جائیں پرستار ترے
سلسلہ کچھ تو ضروری ہے پزیرائی کا

آئینہ عکس کا پابند نہیں ہو سکتا
کیا بھروسہ ہے خدوخال کے شیدائی کا

ہو گیا تلخ ترے عہد میں جینا کچھ اور
وہ یہ سمجھے تھے کہ موسم ہے مسیحائی کا

یاد ہے ساتھ نبھانے کی روایت کس کو
کچھ مداوا نہیں اس شہر میں تنہائی کا

کر دیا تو نے فراموش ہمیں منزل پر
مل گیا ہم کو صلہ بادیہ پیمائی کا

زخم کی داد نہ دے درد کو محسوس بھی کر
کھل رہا ہے ہمیں انداز تماشائی کا

فرق باقی نہ رہا عشق و ہوس میں گلزار
زائقہ ایک ہوا شہرت و رسوائی کا

گلزار بخاری

غزل

آنکھ میں بغض کا خنجر تو زباں آری کی
بات کرتا ہے وہ کس منہ سے وفاداری کی

کھیل کھیلا تھا بہت اُس نے بھی استادی سے
انتہا کر دی تھی میں نے بھی اداکاری کی

ہر قدم پر ہیں یہاں سانپ مگر دیکھ مجھے
سیڑھیاں چڑھتا چلا جاتا ہوں دشواری کی

رنگ لائے گی تو دیکھے گا بہاروں کا غرور
ہم نے پت جھڑ میں جو زخموں کی شجر کاری کی

کیسے ممکن ہے ترا نام نہ آئے اس میں
میں نے فہرستِ شکایات اگر جاری کی

خوف یہ ہے کہ مجھے کون خدا سمجھے گا
اپنی ہیبت نہ زمانے پہ اگر طاری کی

بات اشکوں کی طرح بہنے لگی کاغذ پر
مل کے آپس میں وہ لفظوں نے عزاداری کی

میں کسی ایسے الاؤ میں ہوں غم کے جس میں
وقعتِ آتشِ دوزخ بھی ہے چنگاری کی

ہاتھ پر بھی کہیں لگ جائے نہ کشکول کی چھاپ
مہر چہرے پہ ہے جیسے مری بے کاری کی

پیڑ کاٹا نہیں جا سکتا سنا ہے راحتؔ
شاملِ حال نہ لکڑی ہو اگر آری کی

راحت سرحدی

غزل

جب ضروری ہے کوئی ہیر غزل میں آئے
کیوں نہ کیدو کی بھی تدبیر غزل میں آئے

اونچے محلوں کے منقش درودیوار کی جا
کوئی بے مایہ و دل گیر غزل میں آئے

لوگ کیا آپ کی جزیات لیے پھرتے ہیں
کوئی تصویر ہمہ گیر غزل میں آئے

دیکھتے اور دکھاتے ہیں سخن ور لیکن
خواب تو خواب ہیں تعبیر غزل میں آئے

ہم کبھی بات کریں کاش سلے ہونٹوں کی
اور کبھی پاؤں کی زنجیر غزل میں آئے

جب فلک بوس چناروں کا بیاں ہو ثاقبؔ
کیوں نہ کشمیر ستم گیر غزل میں آئے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چار سُو پھیل گئے کانچ کے ٹکڑے خالد
حسنِ مفہوم کہاں ، کاہشِ تفسیر کہاں

غزلیں

درد کی جھیل ہو گئی ہوں میں
کتنی تبدیل ہو گئی ہوں میں

جس کو دیوار بھی نہ اپنائے
ایسی اِک کیل ہو گئی ہوں میں

روز اِک دکھ سمیٹ لیتی ہوں
مِثلِ زنبیل ہو گئی ہوں میں

عشق ہے ایک آب جو کی طرح
جس میں تحلیل ہو گئی ہوں میں

میرا کردار ہی نہیں جس میں
ایسی تمثیل ہو گئی ہوں میں

مجھ میں رہتی ہے ایک اقلیما
خواب قابیل ہو گئی ہوں میں

حمیرا راحت

اِک لمحے کو سوچا تو
شکر ہے وہ کچھ سمجھا تو

مدت بعد کوئی جگنو
مجھ سے ملنے آیا تو

دکھ نے استقبال کیا
دل کے اندر جھانکا تو

اور پھر کچھ دیکھا نہ گیا
جب سے اس کو دیکھا تو

بے شک جھوٹا ہی کرتا
لیکن وعدہ کرتا تو

اِک نعرہ خاموشی کا
سناٹے میں گونجا تو

ہنس تو رہی ہو تم راحتؔ
آنکھ سے آنسو ٹپکا ۔۔تو

غزل

دل کا فرماں ہے کہ ماحول سے کٹ کر سوچیں
مصلحت کہتی ہے جذبات سے ہٹ کر سوچیں

دور لے جائیں نہ منزل سے یہ اندھے جذبے
آؤ اک بار پھر اک بار پلٹ کر سوچیں

کل تو سورج نہیں آئے گا سوا نیزے پر
شام کو پوچھتی ہیں مجھ سے لپٹ کر، سوچیں

دل کا آئینہ کسی دور میں دھندلا نہ سکے
وقت کی دھول میں رہ جائیں نہ اَٹ کر سوچیں

جا کے قبروں کی مساوات کا منظر دیکھے
وہ جو کہتا ہے کہ طبقات میں بٹ کر سوچیں

یاد آتے ہیں کبھی جب وہ سلگتے جذبے
بین کرتی ہیں مرے ساتھ لپٹ کر، سوچیں

میں نے تعبیر کے موضوع پہ جب غور کیا
لے گئیں خواب بھی آنکھوں سے، جھپٹ کر، سوچیں

دل میں ہر لحہ قیامت کا سماں ہو تو جلالؔ
کیسے آئیں کسی مرکز پہ سمٹ کر، سوچیں

سید قاسم جلال

غزل

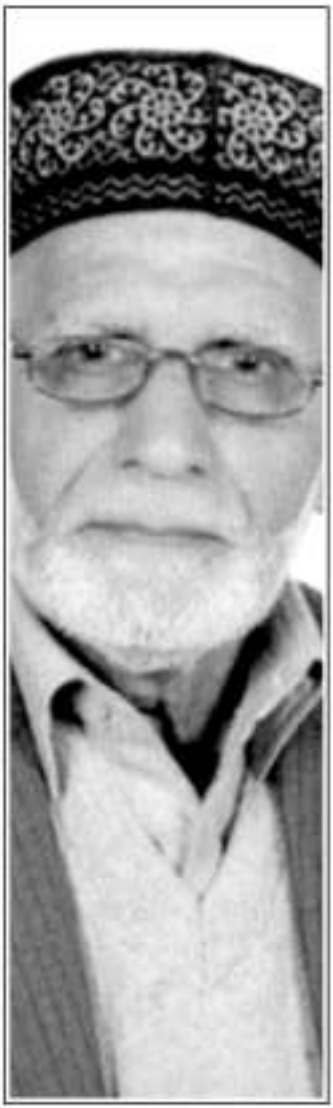

جب سے دیکھا ہے تم کو وفا آ گئی
جان دینے کی سمجھو ادا آ گئی

دیکھ کر جاں فزا مسکراہٹ تری
باغ میں ہر کلی کو حیا آ گئی

گلستاں کا ہر اک پھول کھلنے لگا
تیرا آنا تھا بادِ صبا آ گئی

جب بھی تنہائیوں میں پکارا تجھے
دل کی گہرائیوں سے صدا آ گئی

دل ترے قرب سے جگمگاتا رہا
ہجر میں شامِ کرب و بلا آ گئی

جب بھی ماضی کے کھولے دریچے کبھی
تیرے دامن کی دل تک ہوا آ گئی

آفریںؔ پڑ گئی ماند قوسِ قزح
یاد جب دل کو رنگین قبا آ گئی

رشید آفرین

غزل

کیا کریں اب عشق پہلے سا نہیں
داغ دریا رہ گیا ، دریا نہیں

ہم جہاں پر تھے وہیں موجود ہیں
خواب دیکھا، راستہ دیکھا نہیں

میرے سر پر اک شجر ہے ریت کا
اس شجر کے پاؤں میں سایہ نہیں

رات الٹی ہو گئی ، دن بہہ گیا
چاند میرے ہاتھ میں آیا نہیں

کون ہے وہ، کیسے پہچانوں اسے
وہ کسی تصویر میں رکتا نہیں

اک تصور ہے، کہانی ہے وہ شخص
بت نہیں، پیکر نہیں، چہرا نہیں

میرے چہرے پر تری آنکھیں نہیں
تیری آنکھوں میں مرا چہرا نہیں

سامنے آ، آئینے کی پشت سے
آئینہ تیرے لئے پردا نہیں

مت سمجھ مجھ کو زمانے کی طرح
میں نے جو دیکھا ہے وہ سیکھا نہیں

بس کوئی انگلی پکڑ کر لے چلے
اس سے آگے تو کبھی سوچا نہیں

دوسری دنیا کی باتیں چھوڑیئے
واپسی کا اب کوئی رستہ نہیں

شاہنواز زیدی

غزل

دوستی کر کے بیابان کے ساتھ
جی رہے ہیں فقط امکان کے ساتھ

وہ بھی اپنے ہی بخوں کا نکلا
جب تعارف ہُوا انجان کے ساتھ

بالیقیں سیکھیں گے انمول اسباق
یونہی بیٹھے نہیں نادان کے ساتھ

اِس میں ہوتی ہے مہارت شامل
پُھول سجتے ہیں جو گلدان کے ساتھ

اپنی اُمید بجھی جاتی ہے
ماند پڑتے ہوئے ایمان کے ساتھ

ہم نمٹ لیں گے جھمیلوں سے بھی
لڑ رہے ہیں ابھی طوفان کے ساتھ

کاٹتے جائیں گے اب اپنا سفر
راشدؔ اذکار کے سامان کے ساتھ

ممتاز راشد لاہوری

غزل

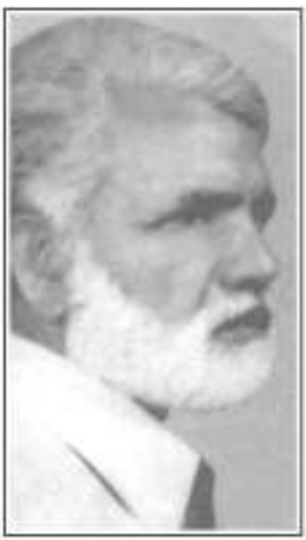

یعقوب پرواز

کبھی تو بحر میں لکھا کرے گا
وہ کب تک کاوشِ بے جا کرے گا

چمکتی دھوپ میں یہ بھی غنیمت
گھنا بادل فقط سایا کرے گا

پلٹنا اس کی قسمت میں نہیں ہے
جو دشمن دور تک پیچھا کرے گا

مرے پسماندگاں کو کیا خبر تھی
یہ مردہ ہی انھیں زندہ کرے گا

گزر جاتا ہے جو آنکھیں چرا کر
مرے سائے کو بھی ترسا کرے گا

بنے گا کیا تری مشقِ ستم کا
ہمارے بعد جی کر کیا کرے گا

کبھی بھولے سے ہی اس کو بھلا دے
بتا پرواز تو ایسا کرے گا

غزل [نذرِ نجیب احمد]

ایسا تو نہیں منزل و جادہ نہیں رکھتے
ہم لوگ فقط حُسنِ ارادہ نہیں رکھتے

نفرت ہو، محبت ہو، کوئی غم ہو، خوشی ہو
ہم کچھ بھی ضرورت سے زیادہ نہیں رکھتے

صورت نہ سہی اک خطِ امکاں تو کھنچا ہے
ہم صفحۂ دل کو کبھی سادہ نہیں رکھتے

رکھتے تو ہیں ہم اور بھی کچھ کام ضروری
لیکن تری چاہت سے زیادہ نہیں رکھتے

کیا اِن سے رہ و رسمِ محبت ہو کہ یہ لوگ
دامن تو کُجا دل بھی کشادہ نہیں رکھتے

بس ایک نظر ہی میں جو ہاتھوں سے نکل جائے
پہلو میں ہم ایسا دلِ سادہ نہیں رکھتے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں ، اگر دوستی چھوڑ دیں

غزل

کچھ لوگ اِس لیے یہاں بے کار مَر گئے
اُن سے بھی پہلے اُن کے عزادار مَر گئے

آیا کوئی تو سانس لیے بام و در نے بھی
جوں ہی گیا کوئی در و دیوار مَر گئے

کہتے ہیں شہرِ شب کے دُکاندار صبح دم
جانے کہاں یہ سارے خریدار مَر گئے

یہ پگڑیاں ملی ہیں وراثت میں، یعنی تُم
سردار اِس لیے ہو کہ سردار مَر گئے

اپنا علم بلند کیے عمر بھر پھرے
فنکار کیا مَرے سبھی شہکار مَر گئے

بامِ عروج پر کوئی بیٹھا کہاں سدا
ایسے گرے کہ پھر پسِ دیوار مَر گئے

کن راستوں کی دھول ہوئے تیرے مبتلا
تُجھ کو خبر کہاں ترے بیمار مَر گئے

سینے میں خواہشوں کے جنازے پڑے رہے
تیرے تمام شوق دلِ زار مَر گئے

اِک شاہ بچ گیا تھا کنیزوں کے بیچوں بیچ
سب بُرجیوں پہ شہ کے وفادار مَر گئے

واجد امیر

غزل

شبہ طراز

ہم کسی خواب کی تعبیر ہوا کرتے ہیں
منہدم کرتے ہو ، تعمیر ہوا کرتے ہیں

بات بنتی ہے کہانی میں ہمارے دم سے
عشق کے باب میں تحریر ہوا کرتے ہیں

جی! بھروسہ ہمیں ہاتھوں کی لکیروں پہ نہیں
خود بنائی ہوئی تقدیر ہوا کرتے ہیں

یہ جو اِک لفظ محبت ہے لُغت میں لکھا
ہم اسی لفظ کی تفسیر ہوا کرتے ہیں

ہم کہ موسم بھی ہیں دلکش سا کوئی منظر بھی
ہر نظر میں ہمی تصویر ہوا کرتے ہیں

ہم ہمہ دان ہیں ہم کو نہ کم کم لینا
ہم جہاں ساز ، جہانگیر ہوا کرتے ہیں

جس نے دی ہے ہمیں یہ جرات اظہار ہُنر
ہم اسی درد کی تاثیر ہوا کرتے ہیں

غزلیں

اسیر مجھ کو سدا اپنے پیار میں رکھنا
ہمیشہ ریشمی بانہوں کے ہار میں رکھنا

خزائیں آنے نہ دینا محبتوں پہ کبھی
وفا کے پھول ہمیشہ بہار میں رکھنا

بچھڑ نہ جائے کہیں ان سے لو چراغوں کی
کھلے دریچوں کو مت انتظار میں رکھنا

نئی رفاقتیں جب استوار کرنے لگو
تو کچھ پرانے مراسم شمار میں رکھنا

لہو کے نقش وہاں معتبر نہ ٹھہریں گے
سبھی گواہیاں خنجر کی دھار میں رکھنا

جہاں کی بھیڑ میں اس کو کہیں نہ کھو دینا
جلیلؔ اس کو نظر کے حصار میں رکھنا

احمد جلیل

اجال عکس مرا آئنہ سنوار مرا
کبھی تو دیکھ لے آکر تو حالِ زار مرا

فدا ہوا ہے یہ دل کیسے جانِ جاں تجھ پر
لگے نظر نہ تو صدقہ ہی اب اتار مرا

کھرا نہیں ہے وہ داد و ستد کا اس کی طرف
محبتوں کا بہت بڑھ گیا ادھار مرا

یہی تو عشق ہے اس کائنات کا محور
یہی جنونِ محبت ہے کاروبار مرا

تو پاکبازوں میں مجھ کو اگر نہیں گنتا
تو عاصیوں میں ہی کر لے کبھی شمار مرا

سمجھ سکے گا نہ تو اسکو واعظِ کم ظرف
نہ آئے گا ترے ادراک میں خمار مرا

دلاتا رہتا ہوں ہر لحظہ میں یقین اسے
یہ اور بات نہیں اسکو اعتبار مرا

فقط یہ دل ہے جو بس میں نہیں ہے میرے جلیلؔ
وگرنہ جانتا وہ بھی ہے اختیار مرا

غزل

اپنے دل کے بوجھ کو بھاری نہیں ہونے دیا
میں نے خود پر عمر کو طاری نہیں ہونے دیا

بھر گیا تھا رنگ مجھ میں برسوں پہلے ایک عشق
حسن سے چہرے کو پھر عاری نہیں ہونے دیا

اک نئی منزل کی جانب پھر مچل کر چل پڑی
دکھ کی بارش کو بھی لاچاری نہیں ہونے دیا

میں نے ہر ساعت بچھائی تھی بساطِ آرزو
لمحۂ فرصت کو بیکاری نہیں ہونے دیا

بس وہی ہستی وہ تیری ماں کہ جس نے عمر بھر
تجھ پہ اوروں کو کبھی واری نہیں ہونے دیا

مجھ کو خود پر ضبط تھا اتنا کہ رخشندہ کبھی
آنسوؤں کا سلسلہ جاری نہیں ہونے دیا

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

غزلیں

جو یار گئے صحراؤں میں
لوٹے نہیں اب تک گاؤں میں

گو جسم ہیں ان کے دھرتی پر
رہتے ہیں یار خلاؤں میں

کیا پھول کھلے ہیں شاخوں پر
کیا خوش ہیں بیٹے ماؤں میں

پتھرائی ہوئی اس نگری سے
چل لوٹ چلیں پھر گاؤں میں

یہ فصل شگفتِ گُل کی ہے
کھلتے ہیں یہ پھول خزاؤں میں

جب سورج صحرا میں اُترے
رہتا نہیں کوئی چھاؤں میں

اعجاز روشن

دوڑتا رہتا ہوں کچھ کام نہیں ہوتا ہے
اور اس پر وہ سرِ بام نہیں ہوتا ہے

میکدے کا نہیں یہ زندگی کا رونا ہے
شام ہو جاتی ہے اور جام نہیں ہوتا ہے

زندہ احساس میں ہر نقش رہے رقص کناں
مردہ احساس کو ابہام نہیں ہوتا ہے

کام ہوتا ہے تو یاروں کو بتاتا بھی نہیں
اور اکثر تو کوئی کام نہیں ہوتا ہے

خاص بن کر نہیں سمجھے گا کوئی انساں کو
درد جب تک کہ یہاں عام نہیں ہوتا ہے

میر و غالب کا سخن ہو کہ ہنر روشنؔ کا
باعثِ گردشِ ایام نہیں ہوتا ہے

غزل

ریاض رومانی

جو بھی غم کے حِصار سے نکلا
سازِ ہستی کے تار سے نکلا

دیکھ بے اختیاریاں اُس کی
جو ترے اختیار سے نکلا

دشت کے دوسرے کنارے پر
ایک ناقہ غبار سے نکلا

نالہ پہنچا فلک کی اُس جانب
جب دلِ بے قرار سے نکلا

تیر نے اسپ کر دیا گھایل
حوصلہ شہسوار سے نکلا

دشت میں رہنے والے لوگوں کا
ربط تیرے دیار سے نکلا

سونے والا کئی زمانوں کا
نیند ٹوٹی تو غار سے نکلا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

غزل

میں وہاں ہوں جہاں اداسی ہے
ہر طرف بیکراں اداسی ہے

آس یونہی نہیں پھلی پھولی
آس کا سائباں اداسی ہے

یوں تو کتنی علامتیں ہیں مگر
غم کا پہلا نشاں اداسی ہے

دل کے حُجرے کا حال مت پوچھو
غم مکیں ہے مکاں اداسی ہے

آج کی رات خوب گزرے گی
شام سے مہرباں اداسی ہے

اے مرے شوخ یہ بتا مجھ کو
تو نے رکھی کہاں اداسی ہے

کل مکانوں میں قید تھی لیکن
آج تو لامکاں اداسی ہے

تُو مکمل نہیں ملا مجھ کو
میرا آدھا جہاں اداسی ہے

عشق گر ہیں بھی میں نے کھولی ہیں
سارا سود و زیاں اداسی ہے

میرا لہجہ ہے میر کے جیسا
میرا سوزِ نہاں اداسی ہے

عمر ساری گزار دی شاہدؔ
آج بھی مہرباں اداسی ہے

افتخار شاہد

غزل

میٹھا سا احساس رہے
تو جو میرے پاس رہے

تیرا ہونا لازمی ہے
ورنہ شہر اداس رہے

چلتا پھرتا دیکھوں تجھے
ملنے کی پر آس رہے

کھلا پرانا اک صندوق
یاد کی جس میں باس رہے

ہر دریا سے گھونٹ بھروں
قائم پھر بھی پیاس رہے

مر جائیں جب جیون میں
بات نہ کوئی خاص رہے

نیلم احمد بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

رخسانہ سمن

وحشت کے تجربات کو عرصہ گزر گیا
محرومیوں کی گھات کو عرصہ گزر گیا

اک وہم سا ہے، اب بھی مرے ساتھ ساتھ وہ
ترکِ تعلقات کو عرصہ گزر گیا

ہوتا ہے تیرے نام پہ اب بھی مجھے جنوں
حالاں کہ میری مات کو عرصہ گزر گیا

توڑا ہے تو نے، اس کو تو اب کر چیاں بھی چن
آئینِ شش جہات کو عرصہ گزر گیا

رکھا ہوا ہے کب سے انھی پتھروں کے بیچ
آئینۂ حیات کو عرصہ گزر گیا

رکھی ہوئی ہے جان ہتھیلی پہ آج بھی
گو اُن تجلیات کو عرصہ گزر گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوندھی سوندھی سوچ سے اُٹھی، جذبوں کی مہکار
راہ مہک کی روک نہ پائی، لفظوں کی دیوار

غزل

وہ ترا ہے جب تجھے اتنا یقیں ہو جائے گا
زندگی کا لمحہ لمحہ پھر حسیں ہو جائے گا

چار دن کے اس تکبر کا بھلا کیا فائدہ
جبکہ ہر اک ذی نفس زیرِ زمیں ہو جائے گا

تیری باتوں میں اگر ہو گی وفا کی چاشنی
تیرا ہر اک لفظ پھر تو دل نشیں ہو جائے گا

تجھ سا دنیا میں بھلا خوش بخت ہو گا اور کون
آخرش وہ بھی ترے دل کا مکیں ہو جائے گا

ان کی عظمت کیا بیاں ہو دونوں عالم ان کے ہیں
ان کا جو خادم بنے گا وہ نگیں ہو جائے گا

وہ سروبہ در حقیقت منبعِ انوار ہیں
ان کے در پر سر جھکا روشن جبیں ہو جائے گا

اقبال سروبہ

غزل

جس کو چاہا وہی کہتا ہے وفا کچھ بھی نہیں
ایسا لگتا ہے مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

مجھ سے جب اُس نے کبھی پوچھا اُداسی کا سبب
مسکرا کر یہ فقط میں نے کہا کچھ بھی نہیں

یوں مجھے اُس نے سرِ بزم فراموش کیا
سن کے ہر بات مری جیسے سنا کچھ بھی نہیں

حادثہ ہو گیا رستے میں مگر لوگ سبھی
ایسے مصروف رہے جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

میں نے لوگوں کی مصیبت میں مدد کی لیکن
اَب کے سیلاب میں میرا تو بچا کچھ بھی نہیں

جس پہ اشکوں کے نشاں تھے وہی بھیجا اُس نے
اَب کی بار اُس نے مجھے خط میں لکھا کچھ بھی نہیں

مجھ سے پوچھے کوئی کیا دل پہ میرے بیت گئی
اُس سے کیا پوچھتے ہو جس کا گیا کچھ بھی نہیں

ان دکانوں کے طلسمات سے خائف ہو کر
خالی ہاتھ آ گیا گھر، میں نے لیا کچھ بھی نہیں

مجھ کو اس بات کا احساس ہوا دیر کے بعد
ہو گئی عمر بسر اور کیا کچھ بھی نہیں

ہجر کا زہر شب و روز پیا ہے طاہر
وقت نے اس کے سوا اور دیا کچھ بھی نہیں

طاہر ناصر علی

غزلیں

میں قصہ لکھ رہا ہوں اس لیے ہر سال مٹی کا
کبھی تو مجھ پہ بھی کھل جائے گا احوال مٹی کا

بظاہر تو سلامت ہی رہے ہیں جسم و جاں اپنے
اُترتا جا رہا ہے روح تک بھونچال مٹی کا

پرندوں کے لیے ممکن نہیں اونچی اڑانیں بھی
فضا میں دور تک پھیلا ہوا ہے جال مٹی کا

زمیں کے خال و خد میں کوئی تبدیلی تو آئے گی
زمانہ پھر سے آتا جا رہا ہے لال مٹی کا

محمد نوید مرزا

خدا کا شکر کر جیسا بھی اور جس حال میں رکھے
کہیں ایسا نہ ہو قدرت تجھے بھونچال میں رکھے

بنا کر خاک سے کب خالی سا رہنے دیا مجھ کو
ہنر اُس نے ہزاروں میرے خدّ و خال میں رکھے

شکاری کو اسیری اور رہائی کی خبر کیا ہو
خدا جانے پرندوں کو وہ کب تک جال میں رکھے

چٹانوں سے بھی ٹکرا کر گزر جاتی ہے یہ آگے
کبھی ہوتا نہیں ہے راستہ یا مال مٹی کا

سنا ہے پھر کسی آندھی کی دستک ہونے والی ہے
مرے چہرے پہ کس نے لکھ دیا ہے حال مٹی کا

کبھی زیرِ قدم پانی، کبھی آنکھیں ہماری نم
نہ یہ دنیا ہے مٹی کی نہ یہ پاتال مٹی کا

کسی کے ذکر کی خوشبو ہمیں تقسیم کرتی ہے
کبھی ماضی میں رکھے اور کبھی وہ حال میں رکھے

زمانوں پر اسی کی دسترس ہے، اُس کی مرضی ہے
کسی کو رنج میں یا لمحۂ خوشحال میں رکھے

غزل

نہ رخ مکاں کی طرف تھا نہ آسماں کی طرف
ہوائیں محوِ سفر تھیں نئے جہاں کی طرف

میں گر رہا تھا زمیں پر گھٹا کے بجرے سے
خدا نے کھینچ لیا مجھ کو آسماں کی طرف

کسی کے لب نہ ہلے کوئی آنکھ نم نہ ہوئی
میں دیکھتا ہی رہا بزمِ دوستاں کی طرف

پڑے تھے سینکڑوں منظر نظر کے کاسے میں
کوئی یقیں کی طرف تھا کوئی گماں کی طرف

نشانچی کو پلٹ کر نہ لگتا کیوں کر تیر
نظر اٹھی تھی غضب کی مری کماں کی طرف

مری پکار پہ لبیک کہہ سکا نہیں دل
کہ دھڑکنوں کا جھکاؤ تھا مہرباں کی طرف

جدائیوں کا کڑا مرحلہ تو آ گیا ہے
پہ کون طے کرے جانا ہے اب کہاں کی طرف

مجھے بھی لوٹ ہی اب جانا چاہیے عادلؔ
پرندے اڑ گئے سب اپنے آشیاں کی طرف

عزیز عادل

غزل

کیا سے کیا بنا ڈالا دل نشیں اداؤں نے
مجھ کو ہم نشیں جانا شہر کے گداؤں نے

دل کبیدہ خاطر تھا اُس کا ذکر سنتے ہی
اک دھمال ڈالی تھی دل میں اپسراؤں نے

کون پا پیادہ تھا العطش لیے لب پر
نقش تک مٹا ڈالا دشت کی ہواؤں نے

بول دو جو کہنا ہے اب نہیں ملیں گے ہم
کان میں کہا آ کر مضطرب صداؤں نے

اُس خدائے بر تر نے مجتمع کیا مجھ کو
لخت لخت کر ڈالا دہر کے خداؤں نے

کوئی ایک چنگاری دل میں ڈال دی لا کر
جب بجھا مجھے پایا شام کی ہواؤں نے

عابدیؔ ترا بچنا اب محال لگتا ہے
ہر طرف سے گھیرا ہے تجھ کو بے وفاؤں نے

علی حسین عابدی

غزل

چمن آرائی میں پڑتا نہیں ہے
یہ پھل رعنائی میں پڑتا نہیں ہے

وہ جب ہو پاس میرے جانیے کیوں
خلل تنہائی میں پڑتا نہیں ہے

چلو یہ بھی ہے اچھا صبر میرا
اُمید افزائی میں پڑتا نہیں ہے

کرم ہے مہربانی ہے یہ دل کی
کہ سر دانائی میں پڑتا نہیں ہے

اگر چپ بھی رہوں تو فرق کوئی
مری گویائی میں پڑتا نہیں ہے

وہی تو دیکھتی ہیں میری آنکھیں
جو بل انگڑائی میں پڑتا نہیں ہے

کھڑا کر لے مزار اپنا جو گھر میں
جہاں پیمائی میں پڑتا نہیں ہے

میں چیخا ہوں سحرؔ ہر ہر گلی میں
کوئی شنوائی میں پڑتا نہیں ہے

حسنین سحرؔ

غزل

سماعتوں کی زبانی سمجھ میں آ جائے
کلام کر کہ کہانی سمجھ میں آ جائے

ہوا اُڑائے تجھے خاک رہ گزر کی طرح
تو میری نقل مکانی سمجھ میں آ جائے

تجھے تو پیاس کا مطلب ابھی نہیں آتا
تو کس طرح تجھے پانی سمجھ میں آ جائے

گراتا آیا ہوں میں اشک سارے رستے میں
خدا کرے کہ نشانی سمجھ میں آ جائے

اندھیرا ہو چکا اے خواب خوش بدن اب تو
مہک کہ رات کی رانی سمجھ میں آ جائے

تجھے یہ شعر بتائے گا میرے بارے میں
کبھی جو مصرعۂ ثانی سمجھ میں آ جائے

میں کیا کروں گا بھلا اِس نئی محبت کا
دعا کرو کہ پُرانی سمجھ میں آ جائے

سمجھ میں آنے لگے گا یہ وقت بھی اشفاقؔ
اگر ندی کی روانی سمجھ میں آ جائے

اشفاق ناصر

غزل

برگد، برنا، شیشم، پیپل ٹھنڈی چھاؤں والے
اس بستی میں پیڑ نہیں تھے اپنے گاؤں والے

سوچ رہا ہوں میرا ہے پرخار، پہاڑی رستا
میرے ساتھ چلیں گے کیسے نازک پاؤں والے

اس دنیا سے بدلہ لے گا آ کر مولا مہدی
اس دنیا نے مار دیے ہیں لوگ وفاؤں والے

اپنے قریوں میں خوشحالی، کھیتوں میں ہریالی
پنجتن پاک کے صدقے ہم ہیں پنج دریاؤں والے

انصر کوئی بات نہیں ہے مجھ میں زندوں والی
پھر بھی یار بناتا ہوں میں شوخ اداؤں والے

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منظر تھے دھیان میں لبِ جُو کس دیار کے
آنکھوں میں تیرنے لگے بجرے خمار کے

غزل

ہمیشہ کی طرح یہ شاعری باقی رہے گی
مرے شعروں میں تیری روشنی باقی رہے گی

ہزاروں آندھیاں چلتی رہیں گی شہرِ جاں میں
بہرصورت نمودِ آدمی باقی رہے گی

ہمیشہ منظروں کے کارواں چلتے رہیں گے
ہمیشہ موسموں میں زندگی باقی رہے گی

گُلِ اُمید سے آتی رہے گی تازہ خوشبو
یقیناً گلستاں میں تازگی باقی رہے گی

اُٹھا لے جس قدر دیوار رستے میں یہ دُنیا
ہمارے درمیاں یہ دوستی باقی رہے گی

چمکتا ہی رہے گا چودھویں کا چاند ہر پل
فضائے آسماں میں چاندنی باقی رہے گی

وسیم عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

غزل

نخلِ امید ثمر بار نہیں بھی ہوتا
چاند ہر رات نمودار نہیں بھی ہوتا

مجھ کو خوش رہنے کا تو مشورہ دیتا کیوں ہے
دیکھ ہر شخص اداکار نہیں بھی ہوتا

خامشی کے بھی مفاہیم ہوا کرتے ہیں
کُھل کے ہر بات کا اظہار نہیں بھی ہوتا

منزلیں شور مچاتی ہوئی مر جاتی ہیں
قافلہ نیند سے بیدار نہیں بھی ہوتا

کیا ضروری ہے کہ ہر آنکھ سے آنسو ٹپکے
آدمی دکھ میں گرفتار نہیں بھی ہوتا

یہ جو بازارِ غم ہجر ہے اس میں اے دوست
گھومنے والا خریدار نہیں بھی ہوتا

ڈوبنے والوں کو معلوم ہے قیمت اس کی
کوئی تنکا کبھی بے کار نہیں بھی ہوتا

باندھ لیتے ہو امیدیں تم ہر اک سے طالبؔ
یار تو یار ہے غم خوار نہیں بھی ہوتا

طالب انصاری

غزل

زندگی کو آجکل وہ مہرباں درکار ہے
دل کی باتیں سُن سکے جو رازداں درکار ہے

دل پہ سیدھی جا لگے ایسی زباں درکار ہے
شاعری کا شوق ہے لطفِ بیاں درکار ہے

کس قدر مجبور ہیں دیکھو تو یہ اہلِ زمیں
ہر دعا کے واسطے اِک آسماں درکار ہے

تارے گن گن تھک گیا ہوں رات ہے لیکن طویل
شب بتانے کے لیے اب داستاں درکار ہے

جس جگہ میری ضرورت ہے وہاں پر میں نہیں
تجھ کو بھی جانا وہاں ہے تو جہاں درکار ہے

ہوں گلوں کے ساتھ جس کو خار بھی دل سے عزیز
اِس چمن میں آجکل وہ باغباں درکار ہے

کر چکا ہے فیصلہ منصف جو تو میرے خلاف
کس لیے پھر اب بھلا میرا بیاں درکار ہے

پھر کوئی منزل تجھے آواز دینے لگ گئی
کیا تجھے شہزاد کوئی کارواں درکار ہے

شہزاد احمد شیخ

غزل

جو سکھانا ہے تو پھر اس ڈھنگ کی باتیں سکھا
کر لوں سب کے دل میں گھر ایسی مناجاتیں سکھا

مجھ کو تنہا کرنے سے پہلے اے میرے ہم نفس
کیسے کاٹوں گا میں تیرے ہجر کی راتیں سکھا

دور سے دیدار کی بس پوری ہونگی حسرتیں
جو بنا دیں آشنا ایسی ملاقاتیں سکھا

اپنے شوقِ گریہ سے موسم زدہ بادل کو تو
کیسے بے موسم ہوا کرتی ہیں برساتیں سکھا

رات کو دن کرنے والے اے مرے شاطر عزیز
جیسے تو چلتا ہے یوں چلنا مجھے گھاتیں سکھا

درد دل، آنکھوں میں آنسو اور تبسم، پیار میں
کیسے دی جاتی ہیں یہ انمول سوغاتیں سکھا

عشق سے نا آشنا ہوں تیرے جلوؤں کی قسم
آ کے اپنے حسنِ دلکش کی مدارا تیں سکھا

ذکی طارق

غزل

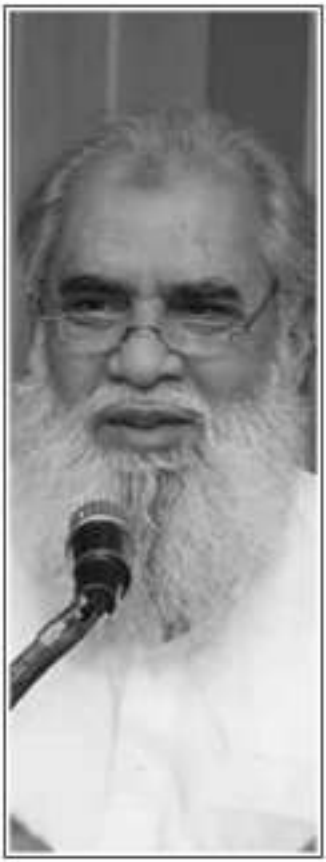

گاڑھی چھنتی تھی مری جن دنوں تقدیر کے ساتھ
نام لیتا تھا زمانہ مرا توقیر کے ساتھ

نیل کے نام لکھے خط کی حقیقت کو سمجھ
ایک طاقت تھی یقیں کی بھی تو تحریر کے ساتھ

آج خود عدل کو، زنجیر نے جکڑا ہوا ہے
اک تعلق تھا کبھی عدل کا، زنجیر کے ساتھ

اختلاف اس سے کرو لاکھ، مگر داد تو دو
کام ہے اس نے نکالا، بڑی تدبیر کے ساتھ

یہ وطن خواب ہے اقبال کا، لیکن اکرمؔ
دیکھنا رکھ کے کبھی خواب کو، تعبیر کے ساتھ

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کے ساتھ چلے ہم، شب بھر
صرف ہوا نے ساتھ نبھایا

غزل

مِرا سایہ اکیلا ہو گیا ہے
مِرا خود ہی سے جھگڑا ہو گیا ہے

جدھر دیکھوں اُدھر خاموشیاں ہیں
بُرا کچھ ایسے اچھا ہو گیا ہے

کروں کیسے بھروسا جیت پر میں
کہ میرے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے

بہت حیران ہوتا ہوں میں سُن کر
عجب سا میرا لہجہ ہو گیا ہے

عجب نظارہ اِن آنکھوں نے دیکھا
جو اَن دیکھا تھا دیکھا ہو گیا ہے

سبھی ہیں خواہشیں میری ادھوری
ترا قصّہ تو پورا ہو گیا ہے

تعجب ہے ابھی تک ہوش میں ہوں
یہاں ہر شخص بہرا ہو گیا ہے

مری آنکھیں نہیں فاروقؔ میری
مرا تو عشق اندھا ہو گیا ہے

زبیر فاروق

غزلیں

آگ کے امتحاں سے گزرا ہوں
تب کہیں گلستاں سے گزرا ہوں

اِک طرف آگ ، اِک طرف پانی
میں کہیں درمیاں سے گزرا ہوں

ہر قدم پر تھی ایک پتلی گلی
میں مگر اپنی جاں سے گزرا ہوں

تُو ہی مجھ پر یقین کر نہ سکا
میں ترے ہر گماں سے گزرا ہوں

کچھ ستارے ہیں میری پلکوں پر
درد کی کہکشاں سے گزرا ہوں

روح تک میں جُھلس گیا ہوں امرؔ
کِس سُلگتے سماں سے گزرا ہوں

امر مہکی

نت نیا زاویہ بدلتا ہے
وہ مگر دائرے میں چلتا ہے

کیوں پریشاں ہے راکھ اُڑنے پر
آگ سے کچھ نہ کچھ تو جلتا ہے

راستہ روکتی ہے سرد ہوا
برف پر پاؤں بھی پھسلتا ہے

چل رہا ہوں مہیب جنگل میں
اب کہاں راستہ نکلتا ہے

سایۂ تاک میں کھڑا ہوں امرؔ
دل دھڑکتا نہیں اُچھلتا ہے

غزل

باہر نکل کے خود ہی کہانی سے آ گئے
کردار تیز تر تھے روانی سے آ گئے

خواہش نمو کی نیند میں تحلیل کیا ہوئی
کچھ تازہ پھول خواب کے پانی میں آ گئے

اک رنگ اتصال کا میلہ لگا ہوا
ہجر و فراق مرثیہ خوانی سے آ گئے

ایسا کرم ہوا ہے کوئی داغ ہے نہ تل
ہم خیر و عافیت سے جوانی سے آ گئے

میں نے اڑا دیئے تھے پرندے خیال کے
لیکن درخت کی وہ نشانی سے آ گئے

دل کی مسافرت کے کئی سنگ میل ہیں
پاؤں اگرچہ نقل مکانی سے آ گئے

امجد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے آنکھیں بھر دیں خالد
کس نے دھول میں پھول کھلایا

غزل

زندگی یہ جس قدر ویران ہے
اس پہ صحرا بھی بہت حیران ہے

کس ہوس میں کھو گیا انسان ہے
بس یہی اس دور کی پہچان ہے

ہو گئی شاداب شاخِ آرزو
موسمِ گل کا کہیں امکان ہے؟

بھول کر دیکھی نہیں دنیا کبھی
ہم فقیروں کی یہی پہچان ہے

آگیا کوئے ملامت سامنے
شکریہ ، یہ آپ کا احسان ہے

ڈوبتے سورج کی آنکھیں نم ہوئیں
چاند کے چہرے پہ جب مسکان ہے

ماجد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

غزل

ارشد محمود ارشد

موت دہلیز پر پڑی ہوئی ہے
زندگی سامنے کھڑی ہوئی ہے

اتنی جلدی بھی کیا ہے جانے کی
تم کو آئے ابھی گھڑی ہوئی ہے

درد بانٹے کسی کا کیا کوئی
سب کو اپنی یہاں پڑی ہوئی ہے

آ تو جاتے شمار میں اُس کے
یار چھانٹی بہت کڑی ہوئی ہے

وہ کسی اور کو نہ دیکھے گا
آنکھ جس سے مری لڑی ہوئی ہے

یہ نگینہ نہیں انگوٹھی میں
اس میں چاہت تری جڑی ہوئی ہے

دیکھ بچے اُدھڑ گئے ارشدؔ
نیک نامی مگر بڑی ہوئی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

غزلیں

ابھی حروف بہت ہیں، یہی تو چند نہیں
مگر سخن سے تجاوز مجھے پسند نہیں

مرا مقام، میرا مرتبہ ہے سب سے الگ
وہ مجھ سے قد میں بڑا ہے مگر بلند نہیں

اسی پہ فخر مجھے ہے کہ میرے ہاتھوں سے
کسی بھی شخص کو پہنچا کبھی گزند نہیں

وہ کم سنی میں اُٹھائے گا کیسے عشق کا بوجھ
مجھے خبر ہے ابھی وہ شعور مند نہیں

نیا کوئی بھی یہاں کیوں نہ ہو سکا داخل
مکانِ عشق کا دروازہ گرچہ بند نہیں

رسومِ شہر اگر سب ہی جاہلانہ ہوں
تو ایسے دور میں سُننا کوئی بھی پند نہیں

جنھیں نشہ ہو صداقت کے جام پینے کا
مزاجِ شاہ کو نوکر وہی پسند نہیں

اچھل اچھل کے نہ یوں ایڑیاں بلند کرو
فلک پہ ڈالی کسی نے ابھی کمند نہیں

زمانہ ساز سمجھتے ہیں آفتاب اُسے
حقیر اُس کو جو سمجھے وہ ارجمند نہیں

آفتاب خان

کسی بھی شے پہ رضامند ہو نہیں سکتا
ترے بنا مجھے آنند ہو نہیں سکتا

کوئی بھی شہر ترے تل پہ وار سکتا ہوں
فقط بخارا سمرقند ہو نہیں سکتا

تجھے جو پیش کیا میں نے، اب سوا اُس کے
تیرے گلے میں گلو بند ہو نہیں سکتا

خدارا سوچ سمجھ کر جدائیاں ہوں عطا
میں تیرے بعد تو خُرسند ہو نہیں سکتا

یہ واقعہ جو ابھی تک بیان ہو نہ سکا
یہ ہو بھی جائے تو، ہر چند ہو نہیں سکتا

جو اک غریب پہ دستِ ستم دراز کرے
وہ بادشاہ کا فرزند ہو نہیں سکتا

ہوں جس میں تار پرائی کپاس کے پیوست
کیوں اُس لباس میں پیوند ہو نہیں سکتا؟

یہ آفتاب ابھی خود ہی زیرِ گردش ہے
کسی ستارے کا پابند ہو نہیں سکتا

غزل

زندہ رہے ہیں ہجر میں شوقِ وصال تک
ہم نے سفر کیا ہے خوشی سے ملال تک

اُس نے کوئی پیام نہ بھیجا مری طرف
میں نے تو انتظار کیا ایک سال تک

راہوں میں صید میرے تعاقب میں چل پڑے
پھینکے گئے ہیں مجھ پہ نگاہوں کے جال تک

ماہِ صیام میں بھی نہ آیا وہ نیکو کار
اب تو گزر گیا ہے یہ "ماہ شوال" تک

تیرا تو حسن نکھرا ہوا ہے بہار میں
لیکن یہ بار ضبط سے میرا بھی حال تک

بد صورتوں کے شہر میں اپنی گزر گئی
چشمِ طلب ترستی رہی ہے جمال تک

مدت سے اُس کو دیکھا نہیں ہے کہیں اسدؔ
قلبِ حزیں میں اس کا نہیں اب خیال تک

اسد اعوان

غزل

وقت کو موڑ کے لانے پہ تلے بیٹھے ہیں
پھر اسے سامنے پانے پہ تلے بیٹھے ہیں

شعر میں اس کے خدوخال دکھانے کے لیے
ہم نقوش اپنے مٹانے پہ تلے بیٹھے ہیں

دیر تک پھول کی تعریف مرے سامنے کی
ایسا لگتا ہے رلانے پہ تلے بیٹھے ہیں

بھول بیٹھے ہیں کہ تحریر ہے دل پر کیا کیا
وہ تو بس خط کو جلانے پہ تلے بیٹھے ہیں

ایک بار اور خفا ہوتے ہوئے دیکھنا ہے
ہم انہیں پھر سے منانے پہ تلے بیٹھے ہیں

ساتھ لے کر ہمیں گلشن میں چلے آئے ہیں
وہ گلابوں کو جلانے پہ تلے بیٹھے ہیں

واسطہ ان کا چٹانوں سے پڑا ہی نہیں ہے
راہ سے ہم کو ہٹانے پہ تلے بیٹھے ہیں

کیوں نہ وہ پیش کریں شوق سے نذرانہ دل
ہم تو گھر بار لٹانے پہ تلے بیٹھے ہیں

اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکیں گے تادیر
جس کی تصویر بنانے پہ تلے بیٹھے ہیں

عنبرین خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزلیں

نیند کے نشے میں محسوس کی تلچھٹ میں نے
ذرا آرام نہ پایا کسی کروٹ میں نے

کسی محرومی کے احساس کا "اظہاریہ" ہے
یہ رویوں میں جو گھولی ہے گھلاوٹ میں نے

اس کے ہونٹوں کا اسے لمس رہا ہے حاصل
انگلیوں میں جو دبا رکھی ہے سگرٹ میں نے

کسی صورت نہیں برداشت کبھی کرنی ہے
اس لگاؤ کی جگہ کوئی لگاوٹ میں نے

لازمی سمجھا تو کی تھوڑی بہت قطع و برید
پر بنائے سے جدا رکھی بناوٹ میں نے

نقدِ دل کے عوض اے میری محبت کے امین
اب گوارا نہیں کرنی ہے ملاوٹ میں نے

کوئی جب عزمِ محبت سے بڑھا میری طرف
پیش قدمی میں نہیں ڈالی رکاوٹ میں نے

بارِ احساں نہ اٹھایا کسی شانے کا کبھی
اپنے سینے پہ اتاری ہے تھکاوٹ میں نے

خواب چپ چاپ حقیقت میں ڈھلا ہے جاذبؔ
کوئی آواز سنی اور نہ آہٹ میں نے

اکرم جاذب

اس سے بچھڑوں بھی تو آنکھوں میں وہ صورت رہ جائے
جیسے احساسِ امارت سرِ غربت رہ جائے

جیسے عجلت میں کوئی گھر سے سفر پر نکلے
جیسے بھولے ہوئے سامان کی خفت رہ جائے

رک بھی جاتا ہے وہ دل رکھنے کی خاطر گاہے
کیا خبر اب کے محبت کی بدولت رہ جائے

وہ پرندوں کی طرح نقل مکانی کر جائیں
مری آنکھوں میں جمی خواب کی حیرت رہ جائے

حیف حاکم کہ جو گر جائے نظر سے سب کی
صرف دستار سے وابستہ فضیلت رہ جائے

ہائے یہ شہرِ سیاست، یہ خرد کی چالیں
شہر اجڑیں کہ بسیں اپنی حکومت رہ جائے

ہم زیادہ کی طلب میں نہیں مرتے جاذبؔ
کوئی وعدہ، کوئی امید سلامت رہ جائے

غزل

کوئی انجان سی گلی ہے ابھی
یہ محبت نئی نئی ہے ابھی

عشق تیرا ابھی نہیں کُندن
اس میں اک آنچ کی کمی ہے ابھی

جان پہچان بھی کبھی ہو گی
بات اس سے مری چلی ہے ابھی

کام ٹوٹے دِلوں کا کافی ہے
اک دکاں شہر میں کھلی ہے ابھی

سو گئے لوگ سارے بستی کے
ایک محفل کہ جاگتی ہے ابھی

کس نے پہنچائی افسروں تک بات
بات ہم نے جو اک کہی ہے ابھی

نہ اُٹھانا نبیل قیصؔر کو
آنکھ روتے ہوئے لگی ہے ابھی

نبیل قیصر

غزلیں

ہو جس نے چھوڑ کے جانا یہاں وہ آئے نہیں
ہمارا دل ہے کوئی عام سی سرائے نہیں

کوئی سبب ہے کہ مدت سے مسکرائے نہیں
بہت سے رنج ہیں لیکن تجھے بتائے نہیں

وہ مہنگی چیز کو سستے میں بیچ دیتا ہے
بھلے وہ بیچ دے لیکن ہمیں گنوائے نہیں

اسے چھوا تو ترا عکس ٹوٹ جائے گا
یہ خوف تھا سو کبھی ہاتھ تک لگائے نہیں

ہمارے جیسوں کو تیری نظر سے مطلب ہے
ہماری خواہشوں میں کوئی چائے وائے نہیں

یہ لوگ یوں بھی مجھے لالچی سمجھتے ہیں
میں چاہتا ہوں جو آئے کبھی وہ جائے نہیں

عدو ہے کون بھلا کس طرح سمجھ سکتے
پرانے یار تو اب تک سمجھ میں آئے نہیں

دکھا چکے ہیں یہ نوک سناں پہ سر رکھ کر
سو عشق کیا ہے ہمیں اب کوئی سکھائے نہیں

بس اس کی ہاں میں فقط ہاں ملانا ہوتی ہے
صغیرؔ عشق کے مسلک میں ہائے ہائے نہیں

صغیر احمد صغیر

اس سے اب گفتگو نہیں ، ہے بھی
جو مرے رو برو نہیں ، ہے بھی

میں اسی کی تلاش میں ہوں ابھی
جو مرے چار سو نہیں ، ہے بھی

ایسی حالت کو کیا کہا جائے
وصل کی آرزو نہیں ، ہے بھی

اس کے کہنے پہ اس کو چھوڑا ہے
دل مرا سرخرو نہیں ، ہے بھی

آج پھر مخمصے میں ڈال دیا
کہہ دیا دل میں تو نہیں ، ہے بھی

غزل

بے سہاروں کا آسرا ہونا
اتنا آساں نہیں خدا ہونا

پھر محبت کی بات کرنا تم
جب محبت سے آشنا ہونا

بے وفائی مجھے نہیں آتی
کتنا مشکل ہے بے وفا ہونا

دل سے کوئی جُدا نہیں ہوتا
سوچ کر مجھ سے تم جدا ہونا

سیکھ لینا ذرا شکیبائی
حرف حق کی اگر صدا ہونا

انگلیاں تم پہ لوگ اُٹھائیں گے
تم زیادہ نہ پارسا ہونا

یہ منافق معاشرہ ہے حکیمؔ
کچھ برائی نہیں بُرا ہونا

حکیم خان حکیم

غزل

کتنے سونے ہیں در و بام تُو آ جا اب تو
ہر طرف پھیل گئی شام تُو آ جا اب تو

کیا کہوں میں تجھے ویران ہے محفل کتنی
مُسکرانا بھی ہے اِلزام تُو آ جا اب تو

مُستقل ٹھیر گئی ہے مرے گُلشن میں خزاں
زرد ہیں لالہ وگلفام تُو آ جا اب تو

راہِ منزل سے بھٹک جاؤں نہ میں دوست کہیں
ہو نہ جاؤں کہیں ناکام تُو آ جا اب تو

وحشتِ ہجر کے افسوں میں گھرا ہُوں کب سے
ڈرنے لگتا ہُوں سرِ شام تُو آ جا اب تو

اِس سے پہلے کہ ساعت نہ مرے ساتھ رہے
چاہتوں کا لیے پیغام تُو آ جا اب تو

میں بھی رانجھا کی طرح تری طلب میں قائلؔ
ہو گیا شہر میں بدنام تُو آ جا اب تو

عمر قیاز قائل

غزل

مری چاہ تجھ پہ یقین تک، مری چاہ وہم و گمان تک
مرا فلسفہ، مرا مسئلہ ہے ترے بدن کی کمان تک

ترے جسم و جان کے زاویے، رہ پُر خطر تھے مرے لیے
میں قدم قدم پہ لٹا ہوں یوں کہ لٹا ہے اگلا جہان تک

مرا تیرنا مرا ڈوبنا ہے تری نظر سے جڑا ہوا
کبھی پہنچا پورے یقین تک، کبھی لحظہ بھر میں گمان تک

مرا جسم تجھ سے جدا سہی، مری روح تجھ سے ملی ہوئی
یہ ملن ہے دل سے زبان کا یہ رہے گا دونوں جہان تک

تری گفتگو کے ردھم پہ تھا مرا اعتبار ٹکا ہوا
مری شاعری مرا نام تھا ترے نام تیرے نشان تک

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا، اس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

چاند جس وقت ڈھلنے لگتا ہے
گھر میں سورج نکلنے لگتا ہے

دو قدم کس کے ساتھ چلتا ہوں
وہ ہی رستہ بدلنے لگتا ہے

پہلے پڑتی ہے دھوپ جسموں پر
پھر تو سایہ بھی جلنے لگتا ہے

سارا منظر بدل سا جاتا ہے
کب وہ پہلو بدلنے لگتا ہے

جب ستارا ہو اوج پر عاصم
کم نظر پھر اچھلنے لگتا ہے

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چشمِ نم جن پہ تھے اہلِ دل ،اہلِ غم
آج ان بستیوں کے نشاں بھی نہیں

غزل

دریا میں ڈال بیٹھے ہیں کشتی انا کے ساتھ
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر نا خدا کے ساتھ

جینا پڑے گا آپ کو میری وفا کے ساتھ
اس نے پیام بھیجا ہے دیکھیں دعا کے ساتھ

سن کے صدا اداس نہ ہو جائے تو کہیں
لپٹی ہوئی اداسی ہے میری صدا کے ساتھ

جب بھی وہ مسکرائے تو اچھا لگے مجھے
مجھ کو قبول ہوگا وہ ہر اک ادا کے ساتھ

حوا کی لاج ہوتی ہے آنچل کی لاج میں
مستور بن کے رہتی ہے عورت حیا کے ساتھ

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ختم رسل ، پیغام بر آخر ، خ اتم اوتار !
اے دست رب نعمت ، اے قاسمؐ ، اے مختارؐ !

غزلیں

بھلے ہوں لاکھ مصائب، اُدھر نہیں جانا!
امیرِ شہر کی دہلیز پر نہیں جانا

تم اس پہ چلنے کی تجویز مسترد کر دو
یہ راہِ عشق کٹھن ہے، اِدھر نہیں جانا

میں عشق کرتا ہوں، وحشت عزیز تر ہے مجھے،
سو میں نے دشت میں رہنا ہے، گھر نہیں جانا

دیارِ عشق میں آسیب کا بسیرا ہے
دوبارہ ایسے کسی بھی نگر نہیں جانا

تری تلاش میں نکلا ہوں، پر نہیں معلوم
کدھر ہے جانا مجھے، کدھر نہیں جانا

علی یہ گھر کی اداسی اور اس میں پھیلا سکوت!
یہ اپنے دوست ہیں، تم ان سے ڈر نہیں جانا

علی آرش

جو اپنے گرد کئی دائرے بناتے ہیں
وہ لوگ اپنے لیے مسئلے بناتے ہیں

جنابِ قیس کی اب پیروی نہیں ممکن
محبتوں کے نئے ضابطے بناتے ہیں

زمین والوں کی آسانی کے لیے صاحب
ہم آسماں کی طرف راستے بناتے ہیں

جدا ہے کام ہمارا زمانے والوں سے
اداس ہونٹوں پہ ہم قہقہے بناتے ہیں

ایازؔ رہتے ہوئے نسلِ نو سے وابستہ
گزشتگاں سے نئے سلسلے بناتے ہیں

محمد علی ایاز

غزلیں

کہہ رہے تھے اور سارے کہہ رہے تھے
بزم میں تیرے ہی بارے کہہ رہے تھے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں تھا
جو تشی جو میرے بارے کہہ رہے تھے

حسن والوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں
رات کو یہ چاند تارے کہہ رہے تھے

آپ گھاٹے میں رہے ہیں عشق کر کے
زندگی کے سب خسارے کہہ رہے تھے

چھوڑ اس کو جانِ جاں کہ لوگ کیا کیا
تیرے بارے میرے بارے کہہ رہے تھے

یہ فراغت بوجھ سے کم تو نہیں ہے
دن ڈھلے فرصت کے مارے کہہ رہے تھے

دل کی ٹھنڈک آنکھ کے تارے ہوں احمدؔ
کون دریا کے کنارے کہہ رہے تھے

احمد محسود

کسی کوئے پامال میں جی رہا ہوں
میں شہرِ زبوں حال میں جی رہا ہوں

کہیں جھیل آنکھوں میں اترا ہوا ہوں
کہیں زلف کے جال میں جی رہا ہوں

کسی اور کا رنگ کیوں آئے مجھ پر
میں اپنے خدو خال میں جی رہا ہوں

وہ جس میں کوئی حادثہ ہو گیا تھا
میں اب بھی اسی سال میں جی رہا ہوں

مرے نکتہ چیں اتنے ناراض کیوں ہو
خبر بھی ہے کس حال میں جی رہا ہوں

غزلیں

محسوس نہ ہو گا کبھی آزار مجھے بھی
جب یار سمجھ لے گا مرا یار مجھے بھی

رکھتا ہوں جنوں کے سبھی آثار چھپا کر
کہہ دے نہ کہیں خلق اداکار مجھے بھی

کس کس کو ترے حُسن کی تعریف سناتا
ہر شخص یہ کہتا تھا کہ سرکار! مجھے بھی

میں ہجر میں دیوار سے اِک بار لگا تھا
دیوار نے کر ڈالا ہے دیوار مجھے بھی

بستی سے چلے جانے کے نقصان بتا کر
کرتے تھے کئی پیڑ خبردار مجھے بھی

اِک دل ہے جسے کوئی بھی اپنا نہیں لگتا
واقف تو ملے شہر میں دو چار مجھے بھی

ازور شیرازی

سفر میں تیغ کو رکھا نہیں نیام کے ساتھ
کہ بادشاہ سلامت رہیں غلام کے ساتھ

ہمارے پاس کوئی سیم و زر نہیں لیکن
تمہارا ہجر منائیں گے اہتمام کے ساتھ

اسے فراق کی شدت سے کچھ نہیں ہوگا
جو کر رہا ہے محبت بھی انتقام کے ساتھ

انھوں نے خود ہی چنا تھا رذیل لوگوں کو
بہت ہی اچھا ہوا ہے مرے عوام کے ساتھ

ثوعشق سے درویش بنا دے تو الگ بات
ورنہ تو ہے دنیا ابھی درکار مجھے بھی

میں ضبط کے معیار سے آگے نہیں آیا
پھر سے سگ دنیا ذرا دھتکار مجھے بھی

مانا کہ بڑے شخص ہو، مصروف ہو لیکن!
دو وقت ملاقات کا اِس بار مجھے بھی

یہ اور بات تری ذات سے تعلق ہے
وگرنہ کام ہی رکھا ہے اپنے کام کے ساتھ

جو شخص شمر کے لشکر میں رات بھر ٹھہرا
طلوع فجر کو دیکھا گیا امام کے ساتھ

یہ سوچ سوچ کے دل کی کسک نہیں جاتی
کہ خاص لوگ مرے ہیں وبائے عام کے ساتھ

غزلیں

محسن رضا شافی

تیرے بارے کہاں سے آتے ہیں
خواب سارے کہاں سے آتے ہیں

سوچتے ہیں ہماری قسمت میں
یہ خسارے کہاں سے آتے ہیں

اس کے چہرے کا ذکر کرتے ہوئے
استعارے کہاں سے آتے ہیں

یہ فضا میں کمان کی صورت
رنگ پیارے کہاں سے آتے ہیں

اشک شافی ہمارے گالوں پر
بن کے تارے کہاں سے آتے ہیں

تاثیر جعفری

آنکھوں کو مصرف میں لایا جاسکتا ہے
خوابوں کا زندان بنایا جاسکتا ہے

لادی جاسکتی ہے وحشت کاندھوں پر بھی
وحشت اٹھا کر گھر تک لایا جاسکتا ہے

اب بھی یار ہتھیلی پر باتوں باتوں میں
سرسوں تو ہر بار اگایا جا سکتا ہے

تیرے لہجے میں کچھ کچھ ہمدردی ہے اب
تجھ کو اپنا درد سنایا جا سکتا ہے

دل جیسے صحرا کی پیاس بجھانے کو تو
دریا بھی آنکھوں سے بہایا جاسکتا ہے

غزلیں

راستوں پر خمار چھایا ہے
تیرا قاصد جہاں سے آیا ہے

چشمِ امید کی فصیلوں پر
اَشک نے مورچہ بنایا ہے

پانی سارے جہان کا پانی
ایک سرداب کی رعایا ہے

شکوہ بنتا ہے تجھ سے خوشبو کا
تو نے پھولوں کا دل دکھایا ہے

غم تو ورثہ ہے باپ دادا کا
ہم نے ہنس کر گلے لگایا ہے

باغباں نے لکھا ہے نغمۂ گُل
فاختاؤں نے خوب گایا ہے

ہونٹ رکھے ہیں اس کے ہونٹوں پر
اِک دیے سے دیا جلایا ہے

احسان علی حیدر

سرسبز مکانوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں
یہ پھول بہاروں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

جو چاند کبھی پاس سے دیکھا بھی نہیں ہے
سب اُس کے ستاروں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

وہ شخص سوالوں کی گرہ کھول رہا ہے
ہم اُس کے جوابوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

لوگوں کو تمنا ہے کہ موضوعِ سخن ہوں
سب آپ کی باتوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

افسردہ مزاجوں کو ہنسانے کی غرض سے
افسردہ مزاجوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

ان میں سے بہت سوں کا نشاں تک نہیں رہنا
یہ سب جو کتابوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

کتنوں کی ملاقات خدا سے نہیں ہوتی
کتنے ہی نمازوں میں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں

اسامہ منیر

غزلیں

سید فرخ رضا ترمذی

کبھی زمین کبھی آسماں بناتے ہیں
تمہارے واسطے اک سائباں بناتے ہیں

یہ نفرتوں کا نگر اور ہم سے دیوانے
محبتوں سے گندھا اک مکاں بناتے ہیں

گلاب بانٹتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں
ہم اپنے شہر میں روشن سماں بناتے ہیں

ہمیں خبر ہے کہ پیاسوں پہ کیا گزرتی ہے
مسافروں کے لیے ہم کنواں بناتے ہیں

وہ ہر کسی سے یہاں بدگمان رہتا ہے
درود پڑھ کے اسے خوش گماں بناتے ہیں

انہیں خبر ہے کہ طوفان آنے والا ہے
سو اس لیے وہ بڑی کشتیاں بناتے ہیں

سفینہ عشق کا ہردم رہے رواں سو ہم
ہوا کے سامنے اک بادباں بناتے ہیں

ہم اپنی خواہشیں بالائے طاق رکھ کے رضاؔ
نگر میں آ کے نیا اک مکاں بناتے ہیں

طارق جاوید

ہجر کا انتظام ہونے لگا
تیرا دل میں قیام ہونے لگا

خامشی سے بھرا ہوا تھا بدن
ایک دن ہمکلام ہونے لگا

معجزہ ہے کہ ہم درختوں میں
دھوپ کا احترام ہونے لگا

پہلے ذہنی غلام تھا یہ بشر
اب مشینی غلام ہونے لگا

جتنا جھکتا چلا گیا ہوں میں
اتنا اونچا مقام ہونے لگا

غزلیں

رنگ بھی بدلے گا، چہرے پہ ملال آئے گا
اس کو جب میری وفاؤں کا خیال آئے گا

ڈوب ہی جاتا ہے ہر شام کو تپتا سورج
سنگ باری پہ تیری بھی تو زوال آئے گا

اے مری جان! اسے دیدۂ حیرت سے نہ دیکھ
یہ مرا خون ہے اس میں تو ابال آئے گا

تم کو معلوم نہیں، مجھ کو یقیں ہے لیکن
خود وہ ڈوبا بھی اگر، مجھ کو اُچھال آئے گا

آرزو خلق کی مخلوق کرے گی جب جب
خالقِ کُل کو تو ظاہر ہے جلال آئے گا

خالق آرزو

لرزتا رہتا ہوں کردے نہ پاش پاش مجھے
تراشتا ہے عجب طور بُت تراش مجھے

کہیں تلاش کا حاصل ترا بدن ہی نہ ہو
نئے جزیرۂ دُنیا کی ہے تلاش مجھے

کسی کے حُسن نے بخشی ہے مجھ کو بینائی
کسی کے لَمس نے بخشا ہے اِرتعاش مجھے

اگر میں ہار چکا ہوں مجھے یقین دلا
شِکست ہی نہیں لگتی شِکستِ فاش مجھے

کوئی تمنا تڑپتی ہے میرے سینے میں
سُنائی دیتی ہے آوازِ دلخراش مجھے

میں اپنے آپ میں ہر روز قتل ہوتا ہوں
مِرے مکان سے ملتی ہے روز لاش مجھے

امتیاز انجم

غزل

کب تک جزا رہوں گا میں اِس بے بسی کے ساتھ
جینا غمِ جہان میں وہ بھی خوشی کے ساتھ

نقصان اُس مقام پہ کافی مفید ہے
بجھتی ہو اپنی پیاس جہاں تشنگی کے ساتھ

ہے شکر آدمی کی ضرورت ہے آدمی
ورنہ کسی کا ساتھ بھی کب ہے کسی کے ساتھ

ہو ہی نہیں رہا تھا ترے زہر کا اثر
آخر ہماری موت ہوئی زندگی کے ساتھ

چپ رہ کے میرے کان کے پردے نہ پھاڑیے
صاحب نہ شور کیجیے یوں خامشی کے ساتھ

ہے اختیارِ عقل پہ غالب ضرورتیں
تعبیر ہو رہی ہے جو نیکی بدی کے ساتھ

دھک دھک تھی انتظار میں ٹِک ٹِک کی ہمسفر
دھڑکن نے کافی وقت گزارا گھڑی کے ساتھ

راضی نہیں ہوں پیروئے مولا رضا بغیر
بس نسبتاً ہی لکھ دیا رضوی رضؔی کے ساتھ

رضی رضوی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

ترے وصل نے جو دیا تھا غم ترے ہجر نے وہ بھلا دیا
تری بیوفائی نے اب مجھے نیا راستہ بھی دکھا دیا

مری زندگی ترے ہاتھ میں یوں کھلونا بن کے ہے رہ گئی
کبھی دل میں کر لیا جاگزیں تو کبھی نظر سے گرا دیا

مرے بے خبر ترے منتظر تری راہ دیکھ کے تھک گئے
ہوا کیا جو اپنے ہی ہاتھ سے تو نے ہر نشاں کو مٹا دیا

رہے ہم وہیں کے وہیں کھڑے تھا چلا جہاں سے یہ قافلہ
نئے رنگ دے کے نگاہ کو نیا خواب تو نے دکھا دیا

نہ ہی حال پوچھا مرا ذرا نہ گلے لگایا تپاک سے
جو کہا تھا تازہ کلام بس یونہی چلتے چلتے سنا دیا

تری بھی رضا تو اسی میں تھی کہ میں لوٹ کے ہی نہ آ سکوں
تری رنجشوں نے مرے گماں کو یقین سے ہے ملا دیا

نائیلہ راٹھور

غزل

کس بلندی کا راستہ ہوں میں
چاند تاروں کو چھو رہا ہوں میں

ہے انوکھی سی کیفیت مجھ میں
ہاں کسی شوخ کی ادا ہوں میں

منظروں کا ہجوم ہے مجھ میں
مثلِ خورشید ڈھل رہا ہوں میں

میں سماتا ہوں سب کے جذبوں میں
ایک ایسی حسیں صدا ہوں میں

اُس کی چاہت ہے میرے سینے میں
ساری دنیا سے ماورا ہوں میں

اُس کے بارے میں کیا کہوں راجاؔ
باوفا وہ ہے بے وفا ہوں میں

راجا شاہد امیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی ساتھ رہے گی کہ وہ یہ دیکھ سکے
سانس کب لیتے ہیں، دم دیتے ہیں نخچیر کہاں

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

لاس ویگس آف دی ایسٹ: جب

ہم میکاؤ پہنچے تو تیز ہوا چل رہی تھی۔ بادلوں نے سارے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور سارا شہر جل تھل ہو گیا۔ ہانگ کانگ کے برعکس میکاؤ بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ عمارتیں بھی بلند و بالا نہیں۔ کہا تو Lasveges of the East جاتا ہے لیکن یہ گنگو تیلی نہ بھی ہو تو راجہ بھوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ویگس تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ازل سے آیا ہوں آپ اپنی مثال بن کر۔ بایں ہمہ میکاؤ ایشیا کے لئے غنیمت ہے۔ چینی اور جاپانی جو بوجوہ دُور دراز کا سفر نہیں کر سکتے یہاں اپنا

شوق پورا کر لیتے ہیں۔ ویسے اس کا تقابل مہاراج دیگس کو چھوڑ کر دوسرے کیسینوز سے کیا جائے تو یہ بڑی سہولت کے ساتھ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔ لندن، ایمسٹرڈیم، سینٹ ونسٹ اور کانز کے کیسینو کچھ اتنے بڑے نہیں ہیں۔ مانٹی کارلو میں دو کیسینوز ہیں۔ مشہور صرف وہ ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا بحر روم کے پانیوں کو محبت سے دیکھتا ہے۔ کیسینوز کے علاوہ یہاں کی ریسیں دنیا بھر میں مشہور ہیں - دن رات گھوڑے دوڑتے ہیں - ہزاروں میل دور بیٹھے لوگ بھی شرطیں بدتے ہیں۔ کیونکہ Live coverage نے کام آسان کر ڈالا ہے۔

میکاؤ کے چار بازار ایک دوسرے کو کراس کرتے ہیں۔ ہر بازار کے آخری کونے پر کیسینو ہے۔ مغربی کونے میں جو عمارت ہے وہ کیسینو کم اور پگوڈا زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی سیڑھیاں سمندر کے اندر تک جاتی ہیں۔ ان سب جوا خانوں کا سرخیل لند Liz Baio کیسینو ہے۔ یہ خاصا بڑا ہے۔ اس کے اندر جانے کے لئے پاسپورٹ دکھانا پڑتا ہے اور مخصوص دنوں میں ٹکٹ بھی خریدنا پڑتا ہے۔ عمارت پانچ منزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی منزل عام گیمبلرز کے لئے ہے۔ دوسری پر ریسٹورنٹ اور بارز ہیں۔ تیسری پر امیر آدمی جوا کھیلتے ہیں۔ دراصل ہر ٹیبل کی ایک Limit ہوتی ہے۔ بازی ایک ڈالر سے شروع ہو کر لاکھوں تک پہنچ سکتی ہے۔ چوتھی منزل کے دروازے اس وقت کھلتے ہیں جب کوئی عرب شیخ جاپانی ٹائیکون یا ملکی دولت پر ہاتھ صاف کرنے والا حکمران کھیلنے آئے۔ ہارنا جیتنا تو مقدر کی بات ہے لیکن اس کی خاطر مدارات دیدنی ہوتی ہے۔ کیسینو اسے مفت پرانی شرابیں اور نوخیز کلیاں پیش کرتا ہے۔ جاپان کی گیشا گرلز کی طرح یہ کام اگر نچلی سطح پر ہو تو اسے دلالی کہتے ہیں اور اگر کارپوریٹ لیول پر کیا جائے تو Business etiquettes کہلاتا ہے۔ انسانی جبلت بھی خوب ہے۔ دو ڈالر کی شراب کے لئے آدمی سو ڈالر ہار جاتا ہے اور پھر واپس گھر جا کر اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے بتاتا ہے کہ وہاں شراب On the house تھی۔

وہ دن خاصا مصروف گزرا۔ موسم خوشگوار تھا۔ قسمت کی دیوی بھی مسلسل مسکرا رہی تھی۔ راجہ نل بھی اپنا راج سنگھاسن چھوڑ کے شاہ صاحب کی مدد کرنے آ گیا تھا۔

وہ جس خانے پر بھی داؤ لگاتے وہ ''حاضر جناب'' کہتا دکھائی دیتا۔ کچھ رقم مجھے بھی بطور خاص مرحمت فرمائی۔ کہنے لگے ''جہاں میں رقم رکھوں تم بھی وہیں رکھ دینا۔ دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

حیران کن بات یہ تھی کہ بلیک جیک کے ٹیبل پر اکثریت بوڑھی عورتوں کی تھی جو بازی جیتنے پر بچوں کی طرح تالیاں بجاتیں۔

ویگس میں مکمل خاموشی ہوتی ہے یہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کارڈ ڈیلر جب پتے بانٹتے ہوئے اپنے لئے پتہ نکالتی تو زالائیں پھر یک زبان ہو کر نعرہ لگاتیں۔ تن یعنی Bust ہو جا۔ اگر تین پتوں کی عددی طاقت اکیس سے زیادہ ہو جائے تو اسے Bust ہونا کہتے ہیں۔ اس صورت میں کیسینو ہار جاتا ہے اور پنٹر جیت جاتے ہیں۔ ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے کیونکہ کمپیوٹر کی رو سے کیسینو کو Initialil advantage ہوتا ہے۔ مجھے بھائی افضل حسین بڑے یاد آئے۔ کاش وہ یہاں ہوتے تو کچھ تو تسکین کا سامان بہم پہنچاتے۔

ہانگ کانگ پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ کھانا ہم نے بوٹ میں ہی کھا لیا تھا۔ مکاؤ تک کا سفر ہر لحاظ سے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ سومیل کے سفر میں سمندر چار رنگ بدلتا ہے۔ جب ہم چلے تو یہ نیلگوں تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد پانی کا رنگ ہرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سرخی مائل ہو گیا اور منزل کے قریب مٹیالا دکھائی دیا۔ مجھے خاصی حیرانی ہو رہی تھی۔ جب پرویز شاہ سے وجہ پوچھی تو بولے ''ساؤتھ چائنا سی بڑا من موجی ہے۔ اس کی مثال اس شریر بچے کی سی ہے جس کی عادتیں لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ گئی ہوں۔ سرخی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دائیں کنارے پر بے شمار ولاز ہیں جن کی چھتیں سرخ رنگ کی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے عکس کی وجہ سے ایسا دکھائی دیتا ہو۔ نظر کی ایک جہت فریب نظر بھی ہے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

کہنے لگے ''پھر کب آنا ہوگا؟''

عرض کیا ''راجہ جی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ ہمارا ہمسایہ ہے اُمید ہے حق ہمسائیگی ادا کرتا رہے گا۔''

سنگاپور...... بار بار دیکھ: لڑکپن میں گانا سنا تھا۔ 'جیون میں ایک بار آنا سنگاپور' چونکہ اس وقت بھی اپنا مزاج عاشقانہ تھا اس لئے ہم نے اس خوبصورت مغنیہ سے یک طرفہ وعدہ کر لیا تھا کہ سنگاپور ضرور دیکھیں گے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں احساس ہوا کہ گائیکہ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ اسے کہنا چاہئے تھا ''جیون میں بار بار آنا سنگاپور'' ہو سکتا ہے وہ خود اس شہر خوش ادا میں نہ آئی ہو اور گیت کار کے شبدوں پر ہی اعتبار کر لیا ہو۔ سنگاپور ہمارے لئے نیا نہ تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی ہم عالمگیر خان کی معیت میں اس کا طواف کر چکے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے وان وا کے چٹ پٹے جملے اور بے لوث پیشکش بھی ہمیں یاد تھی۔ اگر ان وزٹس میں فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس وقت ہمارا بٹوہ کسی مفلس کے گالوں کی طرح پچکا ہوا تھا اور اب کے وہ جیب میں کسی شیر خوار بچے کی طرح ہمک رہا تھا۔ ہم نے اسے نہ صرف افضل حسین کی دستبرد سے محفوظ رکھا تھا بلکہ مکاؤ جا کر شاہ صاحب کی آشیرباد سے مزید

مضبوط اور مستحکم بھی کیا تھا۔ گو ٹھہرنا تو صرف ایک رات تھا لیکن ہم اسے ایک ایسی شب مشکبار بنانا چاہتے تھے جو جوان حوصلوں اور اُمنگوں کا امتحان لیتی ہے۔

سمندر کی اس موج کی طرح جو بڑے کروفر کے ساتھ ساحل کی طرف بڑھتی ہے، ہم نے بھی سنگاپور پر یلغار کی تھی اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم برطانوی سامراج کے ہمیشہ معترف اور معتقد رہے ہیں۔ اگر مٹھی بھر مچھیرے ہندوستان جیسے عظیم ملک پر محض حکمت عملی کی بنا پر قبضہ کر سکتے ہیں تو پھر سنگاپور کو بھی انہوں نے سوچ سمجھ کر ہی آباد کیا ہوگا۔ آنے سے پہلے لغت میں اس کے معنی کھنگالے تو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ یہ 'شیروں کی سرزمین' ہے۔ لغت کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی نظر تاریخ پر ڈال لی کہ جس دیس میں جانا ہو اس کے طور طریقے تو معلوم ہونے چاہئیں۔ قدیم یونان کی شہری ریاستوں کی طرح یہ بھی شہری ریاست ہے جس کا رقبہ صرف ۲۲۱ مربع میل ہے اور آبادی چند لاکھ نفوس پر مشتمل۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اس کے اردگرد پچاس چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن کا مجموعی رقبہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں بنتا۔ سب سے خوبصورت جزیرہ سنتوسا ہے جسے کیبل کار کے ذریعے شہر سے ملا دیا گیا ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جس کی سرسبز پہاڑیوں پر دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ پھر جاپانی توپوں نے سارے شہر کی مزاج پرسی کر ڈالی تھی۔ برطانوی سپاہ شہر کو چھوڑ کر اس طرح بھاگی تھیں جس طرح کوئی رنگین مزاج عاشق اپنی حاملہ داشتہ کو طرح دے جاتا ہے۔

۲۲ جنوری ۱۸۱۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر Sir Thomes Stanford Raffles نے یہ جزیرہ عبدالرحمٰن کے بھائی حسین سے کوڑیوں کے بھاؤ خریدا۔ ولندیزیوں نے دعویٰ کیا تو برطانوی عدالت نے فیصلہ ان کے حق میں کر دیا لیکن جزیرہ کمپنی کو بخش دیا۔ ڈچ صلح پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۲۴ میں ایک معاہدے کی رُو سے سنگاپور اور ملایشیا انگلستان کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ ۱۸۱۱ میں کمپنی نے اسے سلطنت برطانیہ کے حوالے کر دیا اور ۱۸۷۶ میں سنگاپور کراؤن کالونی بن گیا۔ انگریز نے اسے ایشیا کی سب سے بڑی بندرگاہ بنا ڈالا اور ایک مضبوط برطانوی بیڑا رکھا۔ دوسری جنگ عظیم میں پرنس آف ویلز اور Repulse کی تباہی کے بعد یہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور جاپانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر ۱۹۴۵ء تک یہ جاپانیوں کے قبضے میں رہا۔

۱۹۵۹ء میں اسے جزوی خودمختاری مل گئی۔ ۱۹۶۵ء میں خودمختار ملک بن گیا۔ ۱۹۷۱ء میں برطانیہ نے اپنا جنگی بیڑا واپس بلا لیا۔ اس کی تین چوتھائی آبادی چینی نژاد ہے۔ جو زبان یہ بولتے ہیں وہ چین میں نہیں بولی

جاتی۔ لیکن وہ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ باقی آبادی ملائی، ہندوستانی، پاکستانی اور سکھوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ہندی، اُردو، پنجابی اور انگریزی بولتے ہیں۔

ائیر پورٹ سے نکل کر میں نے ایک بار پھر شہر کا جائزہ لیا۔ سڑک کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری جانب گولف کورس ہیں جن میں زیادہ تر نورسٹ گالف کھیلتے ہیں۔ یہ بہت مہنگے ہیں۔ ایک گھنٹہ کھیلنے کا مطلب سو ڈالر سے دستبردار ہونا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں بے شمار ہوٹل ہیں۔ میں نے ہالی ڈے ان میں قیام کیا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد سنوسا آئی لینڈ کی سیر کو نکل گیا۔ فیبر ہلز تو پہلے دیکھ ہی چکا تھا وہاں سے کیبل کار کا ٹکٹ لیا۔ کیبل کار دس پندرہ منٹوں میں پہنچ گئی۔ پہاڑی اور جزیرے کا درمیانی منظر بہت خوبصورت تھا۔ ہزاروں فٹ نیچے نیلگوں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

سنتوسا پہنچا تو ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے جاپانیوں نے سنگاپور پر بمباری کی تھی۔ اسی جگہ سے جنرل یاماشیٹا اور جنرل پری وال کے درمیان سرنڈر پر معاہدہ ہوا تھا۔ ان میں جو بات چیت ہوئی اس سے جاپانیوں کی سفاکی کا پتہ چلتا ہے۔ یاماشیٹا، برطانوی جرنیل کو سانس لینے کی بھی مہلت نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی منت سماجت کی کہ بابا مجھے اتنا وقت تو دے دو کہ میں اپنی حکومت سے ہتھیار ڈالنے کی مہلت طلب کر سکوں لیکن وہ ستم گر اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ اس کا طرز تکلم کچھ اس قسم کا تھا جیسے اپنے ہم منصب سے نہیں بیٹ مین سے بات کر رہا ہو۔ تضحیک اور تذلیل کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں ملتی۔

سارے جزیرے میں مونو ریل چلتی ہے۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سٹیشن بنے ہوئے ہیں۔ سیاح رُک رُک کر جاتے ہیں۔ جوڑے گھنے درختوں کی چھاؤں میں وادِ عیش دیتے نظر آتے ہیں۔ نہ زاہدانِ خشک کا ڈر نہ مفتیانِ دین کی پروا۔ جورا جوری، چنے کے کھیت میں نہیں بلکہ برسرِ عام ہوتی ہے۔ بوس و کنار جذبات میں خلل نہیں ڈالتے اور کسی ۲۵۴ تعزیرات پاکستان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

Morality is the way to behave as you have taught to behave

میں کافی دیر تک سنتوسا کے حسن سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ تماشائے اہل کرم دیکھتا رہا۔ پھولوں کی خوشبو سے مشامِ جاں کو تر و تازہ کرتا رہا۔ جزیرے میں تین چیزیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ چپس، چاکلیٹ اور کوکا کولا۔ اُن کو بھی یکے بعد دیگرے آزمایا۔ واپس آنے سے پہلے لہروں کا لیزر شو دیکھا۔ جب فواروں سے پانی اُچھل کر رنگین روشنیوں سے ٹکراتا ہے تو ایسے پتہ چلتا ہے کہ چند حسینائیں اپنی پتلی کمریا کو لچکائے رقص کر رہی ہیں۔ ایک

لمحے کے لئے گمان ہوتا ہے کہ جل پریوں کے قصے Fantasy نہیں بلکہ حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔
واپسی پر کیبل کار کے بجائے بوٹ پر سفر کیا۔ ایک ٹکٹ پر دو مزے لئے جا سکتے ہیں۔ ساحل سے ڈاؤن ٹاؤن کچھ زیادہ دور نہیں۔ میں پیدل چلتا ہوا بازار میں آ گیا۔ ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں گیا تو چینی سیلز گرلز حسین بھڑوں کی طرح اردگرد بھنبھنانے لگیں۔ ہر ایک اپنی اپنی پراڈکٹ خریدنے پر اصرار کر رہی تھی۔ گھڑیاں، زیورات، کمپیوٹر، ملبوسات، کراکری، کٹلری۔ غلطی سے ایک گھڑی کی قیمت پوچھ بیٹھا۔ سیلز گرل نے پہلے تو میرے حلیے کا جائزہ لیا پھر بولی۔ Oh not much دس ہزار ڈالر۔ اس کے اردگرد ہیرے جڑے ہیں۔ تمہارے لئے خاص ڈسکاؤنٹ۔ تھرٹی پرسنٹ...... اور کیا چاہئے۔
Should I take it out for you- پتہ نہیں اس نے مجھے امیر آدمی کیسے سمجھ لیا تھا۔ شاید پرس کے بجائے اس نے میرے دل کے اندر جھانکا تھا۔ میں See you soon کہہ کر سٹور سے باہر نکل آیا۔ باہر مجھے ایک پاکستانی مل گیا۔ کہنے لگا کبھی بھول کر بھی یہاں سے کوئی چیز نہ خریدنا۔ یہ وہ چینی نہیں ہیں جنہیں ہم بھائی بھائی کہتے ہیں۔ یہ قصاب ہیں۔ دس گنا زیادہ قیمت بتائیں گے اور پھر گاہک کو گھیر گھار کر خریدنے پر مجبور کر دیں گے۔ اگر کچھ خریدنا ہی ہے تو ڈاؤن ٹاؤن سے باہر ایک مسلمان مصطفیٰ کا بہت بڑا اسٹور ہے جہاں سستی چیزیں ملتی ہیں۔ دام ایک ہیں۔ مسلمان جو ہوا!
میں نے ٹیکسی پکڑی اور مصطفیٰ کے اسٹور پر پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ کاؤنٹر پر موجود تھا۔ سہ منزلہ سٹور میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی صرف وہ پھلجھڑیاں نہیں تھیں۔ میں نے ایک کیلکولیٹر خریدا۔ سٹور سے ملحقہ چار پانچ ریسٹورنٹ تھے جن کے بورڈز پر 'شرطیہ حلال گوشت' لکھا تھا۔ کھانا سستا اور مزیدار تھا۔ میں نے چکن بریانی اور مٹن قورمہ کھایا اور واپس ہوٹل میں آ گیا۔

بنکاک...... شعلہ اور شبنم: جب ایئر ہوسٹس نے مائیک پر اطلاع دی کہ ہم بنکاک پہنچنے والے ہیں تو ہمارے جہاز میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ تھائی لینڈ آ گیا ہے۔ ایک انگریز نے بے حیائی سے آنکھ ماری۔ کیا سنتی ہو، ہم بنکاک پہنچ گئے ہیں۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بوڑھے جرمن نے بیوی کو چھیڑا۔ اس ایک لفظ میں نہ جانے کیا جادو تھا جو بجلی کے کرنٹ کی طرح چارسو پھیل گیا۔ جہاز میں کھلبلی مچ گئی۔ کوئی آئینے میں اپنے خدوخال دیکھ رہا ہے تو کوئی شیونگ کٹ اُٹھائے واش روم کی طرف لپک رہا ہے۔ بیشتر مسافروں کے اضطراب کا یہ عالم

تھا کہ کچھ یوں گمان ہوتا جیسے جہاز کے اترنے سے پہلے ہی وہ بنکاک میں لینڈ کر جائیں گے۔ دراصل بنکاک نام ہی ایسا ہے جسے سنتے ہی زاہدانِ خشک لاحول کا ورد شروع کر دیتے ہیں اور وہ جو اتنے خشک نہیں ہوتے انہیں اپنے اندر گدگدیاں ہوتی ہیں اور من میں پھلجھڑیاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔

مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ ایئرپورٹ پر پاکستانی کمیونٹی کا نمائندہ عارف متین الدین جو تھائی لینڈ میں پاکستانی سفیر جنرل کمال متین الدین کا بیٹا تھا اور AIT میں پڑھتا تھا، لینے آئے گا۔ یہ ایک روایت تھی جو کافی عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ ایسوسی ایشن ہر نئے آنے والے طالب علم کے لئے پھل اور پھول بھی بھیجتی تھی۔ ایئرپورٹ پر وہ نہ آیا۔ کریلا نیم پر چڑھ گیا تھا۔ ایک تو جرنیل کا فرزند جو اتفاق سے پشتن کے بعد سفیر بھی بن گیا تھا۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ یونیورسٹی کے محل وقوع کا علم نہ تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تو اجنبی سمجھتے ہوئے اس نے خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔ کورس شروع ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں سیدھا شہر چلا آیا۔ ہوٹل پہنچتے ہی میں نے اپنے پرس کو ایک بار پھر ٹٹولا تو اس میں سے سنان وانگ پوپان کا مسکراتا ہوا کارڈ نکل آیا۔ سنان سے برلن میں ملاقات ہوئی تھی اور وہیں اس نے اپنا تعارفی کارڈ ہمیں تھماتے ہوئے کہا تھا "یہ رکھ لو! ہر شریف آدمی کبھی نہ کبھی بنکاک ضرور آتا ہے۔"

ہوٹل پہنچ کر جب میں نے فون کیا تو فون پر اس کی بیوی بول رہی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بولی وہ اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ ویک اینڈ گزارنے اپنی گرل فرینڈ کے گھر گیا ہے۔ مجھے چکر آ گیا۔ کس قدر اطمینان سے بات کر رہی تھی۔ رقابت کی آگ تو دور کی بات ہے دھواں تک اُٹھتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ صبح اس کا فون آ گیا۔ بڑا خوش لگتا تھا۔ بولا: تیار ہو جاؤ۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ جب اُس کی کار میں بیٹھ کر ہم اے آئی ٹی کی طرف جا رہے تھے تو میں اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔

"رات تم گرل فرینڈ کے پاس تھے؟"

"ہاں تھا!"

"تمہاری نصف بہتر محسوس نہیں کرتی؟"

"بالکل نہیں"

"وجہ.....؟"

کیونکہ نصف یہ ہے اور بہتر دوسری جس کے ساتھ میں نے رات گزاری ہے۔ روم میں رہتے ہوئے بھی رومنوں کی بود و باش کو سمجھنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔

جب ہم یونیورسٹی میں پہنچے تو دن کے دو بج رہے تھے۔ درس گاہ شہر کے اندر نہیں بلکہ چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔ ڈان موانگ ایئرپورٹ سے نکلتے ہی جو سڑک بائیں ہاتھ مڑتی ہے وہ بنکاک جاتی ہے اور دائیں ہاتھ کی شاہراہ رنگ سٹ سے ہوتی ہوئی اے آئی ٹی کی طرف جا نکلتی ہے۔

سڑک صرف درس گاہ تک نہیں جاتی بلکہ چنگ مائی اور چنگ رائی جانے کے لئے بھی یہی راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی:

AIT بہت بڑی درسگاہ ہے۔ غالباً ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی جو U.N.Sponsered ہے۔ کسی زمانے میں یہاں Seato کا ریجنل دفتر ہوتا تھا۔ بہت وسیع و عریض کیمپس ہے جس میں بے شمار عمارات، ہوٹلز، کلاس روم، گالف کورس، سوئمنگ پولز، فٹ بال گراؤنڈ اور ایک فائیو سٹار ہوٹل بھی ہے۔ اس میں سائنسی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ فیسیں بہت زیادہ ہیں جو عام طالب علم کی پہنچ سے باہر ہیں اس لئے ہر لڑکے کو کوئی نہ کوئی بین الاقوامی ایجنسی Sponser کرتی ہے۔ دو ہزار ڈالر فیس کے علاوہ کھانے پینے کے لئے بھی وظیفے دیتی ہے۔

سنان مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ خاصی مایوسی ہوئی۔ چھوٹا سا کمرہ جس کی دیوار پر بجلی کا پنکھا لگا ہوا تھا۔ تھائی لینڈ کا موسم گرم مرطوب ہے اس لئے گرمی کی حدت کو وہ کسی طور روک نہیں سکتا تھا۔ ٹائلٹ بھی الگ سے نہ تھا۔ دو کمروں کے لئے ایک واش روم تھا۔ فرش پر قالین چھوڑ چٹائی تک نہ تھی۔ لگتا تھا پلنگ بھی تھائیوں نے اپنے قد بت کے حساب سے بنائے ہیں۔ گو اپنی ساری تعلیمی عمر ہوسٹلوں میں گزری تھی اور پاکستانی ہوسٹل اس سے بھی گئے گزرے تھے لیکن ماحول بدل گیا تھا اس کے علاوہ عمر کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ہمیں خوبصورت ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ٹیلیفورڈ لاج کے کمرے بڑے کشادہ، کارپیٹڈ اور کوزی تھے۔ برلن میں بھی ہم محل نما عمارت میں رہے تھے۔ ہوسکتا ہے اس انکار میں پندار مناصب کا عمل دخل بھی ہو۔ شام کو جب یونین کے صدر صدیقی صاحب ملنے آئے تو انہیں اپنی بپتا سنائی۔

کہنے لگے ''اس کمرے کا کرایہ صرف دو باٹ (ایک روپیہ) یومیہ ہے۔ اس سے سستی رہائش گاہ تو تھائی لینڈ کے بارڈر پر بھی نہیں ملتی۔ ہوٹل کا کرایہ ہزار باٹ یومیہ ہے۔ کیا آپ دے پائیں گے؟'' شام کو ہم نے واشنگٹن میں کورس ڈائریکٹر کیون شیفر سے بات کی۔ کہنے لگے ''امریکی ایڈ پروگرام کے تحت آپ کو بارہ سو ڈالر ماہوار ملیں گے۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ کسی فٹ پاتھ پر سو جائیں یا فائیو اسٹور ہوٹل میں رہیں۔'' اس وقت ۴۲ باٹ کا ڈالر تھا۔ قریباً پچاس ہزار باٹ بنتے تھے۔ میں ہوٹل میں چلا گیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے طالب علم ہونے کی وجہ سے کرایے میں 50% کمی کر دی۔ پندرہ ہزار میں ایک سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل کچھ خاص مہنگا نہ تھا۔

کلاس شروع ہونے سے پہلے

Orientation ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ کا نیا سربراہ آیا تھا۔ پریذیڈنٹ نارتھ۔ ان دنوں اس کی تنخواہ دس ہزار ڈالر تھی۔ ٹیکس فری۔ جب بھی کوئی پوسٹ خالی ہوتی تو ساری دنیا میں ایڈورٹائز ہوتی۔ نارتھ کی تقریر کا سارا زور ڈسپلن پر تھا۔ اگر کوئی لڑکا ایک سمیسٹر میں بھی فیل ہو جاتا تو اس کی چھٹی کرا دی جاتی تھی۔ لڑکے بڑی محنت کرتے اور ساری رات پڑھتے۔ فیسوں کے علاوہ ان کا وظیفہ بھی یونیورسٹی لے لیتی اور انہیں معمولی سا جیب خرچ ملتا۔

ہماری کلاس میں تیس لڑکے تھے۔ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ہندوستانی اور کچھ طالب علم نیپال سے آئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک طویل عرصہ سے کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ اس کے برعکس ہم لوگوں کی اس سے رسمی علیک سلیک بھی نہ رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے اپنے پیپر کے Preamble میں لکھا تھا۔

This was analogus to the entry of Alice in wonderland

استادوں میں بھی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ پوری یونیورسٹی میں دو پاکستانی کمپیوٹر کا مضمون پڑھاتے تھے۔ اشرف ہیرا اور ایک دوسرا تھا۔ کورس ڈائریکٹر ایک تھائی کن ہان کچنانن تھا۔ وہ بھی خاصی حد تک ہندوؤں سے مرعوب تھا۔ پاکستان سے پانچ آدمی آئے تھے۔ دو بلوچستان، دو فرنٹیئر سے اور پانچواں میں تھا۔ ہمیں چار ماہ کے قلیل عرصے میں دو زبانیں Basics اور Cobol سیکھنی تھیں۔ پہلے دن کورس ڈائریکٹر نے بتا دیا تھا کہ کورس کے اختتام پر امتحان نہیں ہوگا بلکہ چار ماہ کی پرفارمنس پر Assesment ہوگی۔ جب ہندوؤں کو پتہ چلا کہ پاکستانی اس شعبے میں بالکل کورے ہیں تو انہوں نے اپنے ہم وطن کپیل گپتا کے ذریعے کہان کو مجبور کیا کہ کورس کے اختتام پر باقاعدہ امتحان لیا جائے۔ وہ ایک طرح سے مسلمانوں پر اپنی برتری ثابت کرنا چاہتے تھے۔ سب لڑکے میرے پاس آ گئے کہنے لگے "شاہ صاحب کچھ کریں۔ ہماری بڑی سبکی اور رُسوائی ہوگی۔"

میں نے انہیں تسلی دی۔ جب کورس ڈائریکٹر سے بات کی تو وہ کہنے لگا "یونیورسٹی کسی وقت بھی اپنا فیصلہ بدل سکتی ہے۔ پہلے دن کا کہا ہوا کون سا صحیفہ ہے جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "اس صورت میں ہم اس کو اعلیٰ ترین سطح پر Challenge کریں گے۔ شاید تم نے قانون نہیں پڑھا۔ اس میں ایک Term ہوتی ہے جسے Estopple کہا جاتا ہے۔ آپ ایک بات کہہ کر اس سے منحرف نہیں ہو سکتے۔" اس کیس میں You are estopped by your own conduct وہ ڈر گیا اور کافی ردوقدح کے بعد اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ ہندو

استاد کپیل گپتا اصل 'کلپرٹ' تھا۔ اس کے ساتھ تعلقات خاصے خراب ہو گئے۔ ایک لڑکے نے باقاعدہ اس کی ہجو لکھ ڈالی:

یہ جو تیرا کپیل گپتا ہے
ہم تھے سمجھے شکیل گپتا ہے
بعد پڑھنے کے اب ہوا معلوم
یہ نہایت ذلیل گپتا ہے

.....

ابھی ایک اڑچن دُور ہوئی ہی تھی کہ ایک نئی افتاد آن پڑی۔ شعبہ طلبا کے انچارج سرشتہ نے ہمیں بلا کر بتایا کہ یونیورسٹی کے ضابطوں کے مطابق ہمیں بھی اپنے سکالر شپ کی سب رقم جمع کرانی ہوگی۔ لڑکے پھر میرے پاس آ گئے۔ ''شاہ بادشاہ بچاؤ۔''

پشاور کا عبدالرحمٰن بولا ''خوچہ ہم نے تو ٹی وی اور فرج گھر لے کر جانا ہے۔ اس طرح تو نسوار کی ڈبیا بھی خریدنی مشکل ہوگی۔ منصور شاہ کی ٹانگ میں بچپن سے کوئی نقص تھا۔ اسے آپریشن کے لئے رقم درکار تھی۔ کوئٹہ کے لڑکے بھی خاصے پریشان تھے۔ ایک نے جیب سے کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر بیوی بچوں کی فرمائشیں درج تھیں۔ آسٹریلیا میں ڈچ پروفیسر تھیو کہا کرتا تھا کہ ہندوستانی اور پاکستانی لڑکے ڈبل روٹی اور خشک میوے کھا کر گزارا کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر انہیں الیکٹرانک گڈز اپنے ساتھ لے جانی ہوتی ہیں۔ میں سرشتہ کو ملا اور رقم دینے سے انکار کر دیا۔ وہ رولز کی کاپی لے آیا۔ میں نے کہا تمہاری تشریح صریحاً غلط ہے اس کا اطلاق شارٹ کورسز پر نہیں ہوتا۔ اس نے واشنگٹن میں ہماری شکایت کر دی۔ اتفاق سے وہ بھی ہندو تھا۔

کورس ڈائریکٹر کیون شیفر غالباً کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ سرکاری خرچ پر بنکاک کی سیر! اس کا پیغام آیا کہ وہ خود آ کر فیصلہ کرے گا۔ چند دنوں بعد وہ پہنچ گیا۔ پہلے وہ یونیورسٹی انتظامیہ کو ملا۔ پھر ہمارے پاس آیا۔ آتے ہی بولا ''مسٹر شاہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے سرشتہ نے یونیورسٹی رولز پڑھائے ہیں۔ ان کی رُو سے

You shall have to part
"with your scholar ship

میں نے کہا ''مسٹر شیفر! اس نے ضابطے دکھائے ہیں۔ تعزیر سے آگاہ نہیں کیا۔ کاش تمہیں ہندوستان کی ایک ہزار سال کی تاریخ سے آگاہی ہوتی۔''

''وہ کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکمرانی کی ہے ایک ہزار سال سے ہماری ہندوؤں کے ساتھ مخاصمت رہی ہے۔ جب میں نے تقسیم کے وقت اُن کے مظالم کا ذکر کیا تو کیون شیفر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اگر اردو جانتا تو ضرور کہہ اُٹھتا۔ ''شاہ باوے! بس کر، میں رونے لگا ہوں۔''

[جاری ہے۔]

دراز پلکوں کے سائے سائے

بعض لوگ تمام عمر سمجھ میں نہیں آتے وہ نظر کچھ آ رہے ہوتے ہیں مگر دراصل ہوتے کچھ اور ہیں:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

.....

خالد احمد ایک ایسا ہی شاعر ہے جس کے بارے میں جاننے والے شاید فقط یہی جانتے ہیں کہ وہ ایک ہنس مکھ، بذلہ سنج لطیفہ گو، بات بات پر قہقہے بکھیرنے والا انسان ہے البتہ شعر سے بھی اس کا تعلق نہایت سنجیدہ ہے کہ فنی حوالے سے قدرے پختہ شاعری کر لیتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ کبھی کبھار سنجیدہ ادبی گفتگو بھی کر لیتا ہے۔ احباب کی محافل میں مسکرا کر بلکہ قہقہہ لگا کر بات کرنا اس کا خاص انداز ہے۔ بعض احباب اسے ایک عمر سے ایسا ہی دیکھ رہے ہیں۔ بعض کے مطابق وہ خوش لباس ہونے سے زیادہ خوش خوراک ہے لیکن اس کے قریبی دوست جانتے ہیں کہ وہ ایک ہمدرد مخلص اور احباب پر خرچ کرنے والا شاعر ہے۔

خود میں بھی اس سے زیادہ خالد احمد سے شناسائی کا دعویدار نہیں تھا۔ مجھے بھی وہ بظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا جیسا عام زندگی میں لگتا ہے۔ مگر اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد مجھے اس کے بارے میں کئی بار غور کرنا پڑا۔ چند ماہ قبل اس نے مجھے اپنی دو کتابیں دیں جن

اختر شمار

میں اس کے کالموں کا مجموعہ ''لمحہ لمحہ'' کے علاوہ اس کی شعری تصنیف ''دراز پلکوں کے سائے سائے'' شامل ہے۔ دونوں کتابوں کی تعارفی تقریب بھی ہو چکی، اس پر محترم احمد ندیم قاسمی سمیت دیگر اہل قلم اظہار خیال کر چکے مگر میں تا حال ان کتابوں میں گھرا ہوا ہوں۔ خصوصاً ''دراز پلکوں کے سائے سائے'' میں خالد احمد کی شخصیت بالکل اور طرح کی نظر آنے لگی۔ کئی روز سے میں اپنے تاثرات رقم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بات ظاہر اور باطن کے درمیان کہیں الجھ جاتی کہ وہ دکھائی کیا دیتا ہے اور وہ ہے کیا؟

کئی برس قبل '' دراز پلکوں کے سائے سائے'' کا اشتہار فنون میں دکھائی دیا تھا کس قدر خوبصورت نام ہے یہ۔ نام پڑھتے ہی کتاب پڑھنے کا جی چاہتا ہے مگر اس کتاب سے قبل خالد احمد کے دو شعری مجموعے شائع ہو گئے۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب میں خالد احمد نے ''دراز پلکوں کے سائے سائے'' کے لیٹ ہونے کی وضاحت کی۔ ہمیں دراز پلکوں کے سائے سائے سے قبل پہلی صدا پرندے کی اور مٹھی بھر ہوا پڑھنے کو ملی۔ ان دونوں کتابوں سے بھی مجھے حیرت ہوئی تھی۔ خالد احمد اپنے فن میں اپنی زندگی سے کتنا مختلف دکھائی دیتا ہے۔

وہ اپنی شاعری میں اپنے عقیدے سمیت ایک دردمند انسان کے روپ میں نظر آتا ہے۔ بظاہر کھلنڈرانہ طبیعت کا مالک خالد احمد اپنی شاعری میں ایک سنجیدہ فکر، حساس اور انسانوں کے لیے درد بھرا دل رکھنے والا فنکار ہے۔

دراز پلکوں کے سائے سائے میں وہ بطور مسلمان پاکستانی ایک دردمند انسان اور خوبصورت تخلیق کار کے طور پر نمایاں ہے۔ اس کی تحریروں سے بھی اللہ اور اس کے رسول سے والہانہ عشق اور لوگوں سے محبت کی جھلکیاں جا بجا محسوس کی جا سکتی ہیں۔

کئی برس تک غلط فہمی کی بناء پر میں خالد احمد سے دور رہا اور اس کے بارے میں ایک غلط تاثر دل میں لئے پھرتا رہا حالانکہ اس سے پہلی ملاقات ملتان کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ اس نے میری پہلی کتاب روشنی کے پھول پر لاہور میں اس زمانے کے پاپولر ترین اخبار 'امروز' میں کالم لکھا تھا۔ اصولاً مجھے اس کی دعائیں یاد رکھنی چاہیے تھیں۔ وہ نئے اور جینوئن تخلیق کاروں کے لیے دعا گو رہتا ہے، انھیں راستہ دیتا ہے مگر میں لاہور میں اس کی قربت سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ یوں اس کی تخلیقی صلاحیتوں سے نا آشنا رہا حالانکہ فکر و فن میں اس وقت خالد احمد سے زیادہ اہم شاعر لاہور میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے نامور اور قد آور شعرا کو بعض اوقات عروض کے حوالے سے خالد احمد سے رجوع

کرتے دیکھا ہے۔ وہ نوجوان شاعروں ادیبوں سے بے پناہ محبت کرنے والا دوست ہے۔ وہ سچی اور کھری بات کرنے والا ایک ایسا تخلیق کار ہے جو اپنے بارے میں کبھی فکر مند نہیں ہوا۔ اپنی پروجیکشن کے لیے کبھی جوڑ توڑ کرتا نظر نہیں آتا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی خاندانی روایت اور تہذیب کے حوالے سے اپنے بڑوں اور چھوٹوں سے بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ ادب کا قرینہ ہی اس کی کامیابی کا زینہ محسوس ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی سے غیر مشروط محبت وعقیدت اور ادب نے اسے بہت کچھ دیا۔ 50 برس سے ادپر ہونے کے باوجود اسے جذباتی ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

وہ عجیب زندگی گزار رہا ہے۔ بظاہر ست بے نیازانہ مگر اندر سے حواس بیدار لوگوں کی طرح باہوش، وہ اپنے کام سے غافل نہیں ہوتا۔ ذمہ داریوں اور کمٹمنٹ سے کبھی نہیں بھاگتا۔ بظاہر اس کی باتوں اور ہنستے ہوئے جملوں سے احباب ناراض ہوتے ہیں مگر وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔ میں اسے دنیا دار سمجھتا تھا مگر وہ اپنے اندر درویشوں والی صفات رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت دیکھنی ہو تو اس کے اشعار میں دیکھئے۔ اس کے مصرعوں میں اس کی آنکھوں کی چمک اور تفکر موجزن رہتے ہیں۔ ادب اور عقیدت کا اظہار" دراز پلکوں کے سائے سائے" کے پہلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔ احمد ندیم قاسمی کے لیے اس کے شعر ہیں۔۔

کوئی فن کوئی پیرایہ ترے شایاں نہیں پایا
تجھے میں نے چھوا لیکن بہت محتاط نظروں سے
پس الفاظ دل رکھ کر ترے عکسوں کو دہرایا
تجھے میں نے گزارا ان گنت آئینہ خانوں سے

.....

دراز پلکوں کے سائے سائے میں اردو پنجابی سرائیکی اور ہندکو کو ایک لڑی میں پرونے کی تخلیقی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ اور اس کے لیے خالد احمد نے صوفی شعرا کی روایت کو اپنے لہو میں گھول کر شعری جامہ پہنایا ہے۔ علاوہ ازیں یہ شعری تصنیف ایک داستانوی انداز میں تخلیق کردہ ایک ایسا شعری منظر نامہ ہے جو ہم سے کہیں کھو گیا تھا اور خالد احمد نے اسے پھر سے زندہ کر کے ہمیں پیش کر دیا ہے۔ بہت سے جیتے جاگتے مناظر، زندگی کے دکھ سکھ، تہذیبی روایات، رسوم کا مرقع پلکوں کے سائے سائے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دم توڑتی تہذیب اقدار روایت ادب ومحبت اور زندگی کے مسائل کو زیر بحث لانے کے ساتھ ساتھ خالد اپنے باطنی کرب واحساسات کو نہایت چابکدستی سے پیش کرنے میں بھی کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ وہ تصوف کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتے ہوئے امن کے گیت کاغذ کی گود میں سلا رہا

ہے۔ حمید نسیم نے سچ کہا ہے کہ ''وہ امکانی طور پر ہماری نئی قومی زبان کا پہلا اردو شاعر ہے۔ وہ نئی قومی زبان جو اردوئے معلّٰی اور سرائیکی بولی کا آمیزہ ہوگی یعنی میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب اور مرزا داغ کی رواں اردو اور سلطان باہو بلھے شاہ کی شعری فرہنگ کا آمیزہ۔''

چند مثالیں --- ملاحظہ ہوں۔

کیا بتلائیں کس رستے کی انگلی تھامی تھی
گرد راہ حیات ہوا کیوں دل سا شاہ سوار
دنیا ایک ہمارے پیروں کی زنجیر ہوئی
لوگ دلوں پر پاؤں دھرتے کر گئے دنیا پار
وہ چاندی کا چہرہ وہ پیتل کی بالیاں
وہ گل رنگ پکھیرو وہ پیپل کی ڈالیاں
وہ چرخوں کی گھوکر وہ ڈھولک وہ ڈالیاں
وہ بہنوں کی جھڑکیں وہ ماؤں کی گالیاں
روح جدا کرتن ہے تن سے الگ پر چھائیاں
چُورا چُورا کر دے توڑ مروڑ کلائیاں
پلکیں نوچ لے بھانویں آنکھ میں پھیر سلائیاں
کھال ادھیڑ دے لیکن طعنے مار نہ سائیاں

.....

''دراز پلکوں کے سائے سائے'' میں کثیر تعداد نظموں کی ہے۔ بہت سی شخصیات پر نظمیں خالد احمد کا ان سے اظہار عقیدت و محبت ہے بعض نظمیں اچھوتے اسلوب، اور گہرے فکری رویوں کی عکاسی ہیں۔ مثلاً ''ہوا مغرب کی بیٹی ہے''۔ اس نظم کی چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

ہوا کی مٹھیوں میں خاک ہے
خار و خس و خاشاک ہیں کاغذ ہیں پتے ہیں
ہوا لہروں کی دشمن ہے
ہوا دیزے نہیں لیتی
ہوا اپنی حفاظت آپ کرتی ہے
ہوا مغرب کی بیٹی ہے
ہوا دھندہ نہیں کرتی
ہوا محبوب کی مرضی پہ چلتی ہے

اور

ہوا رنگوں کی دشمن ہے مگر خوشبو کی ساتھی ہے
ہوا مر مر کے جیتی ہے
ہوا جی جی کے مرتی ہے
ہوا محشر اٹھاتی ہے مگر سازش نہیں کرتی

.....

مختصر یہ کہ خالد احمد کا یہ شعری مجموعہ گذرے برس کا اہم ترین شعری مجموعہ ہے جس میں خالد احمد بالکل ایک نئے اور اچھوتے اسلوب کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں۔ میں اس تازہ کاری پر انھیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہی کہہ سکتا ہوں۔

تیری پوریں چُن لیتی ہیں خوشبوؤں سے موتی
تیری آنکھیں سن لیتی ہیں رنگوں کی جھلکار
راہ جمال کی روک نہ پائے شیشے کی دیوار
عکس کے ساتھ اترا ئے خالد آئینے کے پار

☆☆☆☆☆

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی اردو ادب میں ایک معروف شخصیت ہیں، انھوں نے افسانے، ناول، سفرنامے اسٹیج ڈرامے، ریڈیو ڈرامے، خاکے، مضامین اور ادب کی مختلف اصناف پر بہت لکھا اُن کے افسانوں کے مجموعے ..... ان کہی، چپ، گڑیا گھر، گہما گہمی، اسمارائین، روغنی پُتلے، سے کا بندھن، کہی نہ جائے ان کتابوں کا مجموعہ ''مفتیانے'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ (ناول) علی پور کا ایلی، الکھ نگری، (سٹیج ڈرامے) نظام سقہ، لوک ریت، (ریڈیو کے بے شمار ڈرامے) (مضامین) رام دین، غبارے، خاکے، اوکھے اولڑے، اوراوکھے لوگ، (سفرنامے) ہندیاترا، لبیک، بچوں کے لیے چار کتابیں لکھیں۔

1964 میں ممتاز حسین آسی کے نام سے جماعت اسلامی کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک سال بعد اُس کا انگریزی ترجمہ کر کے grandeur of Delusion کے نام سے شائع کی:

اعزازات: ہجر، ایوارڈ	1982
ستارۂ امتیاز	1985
نقوش ایوارڈ برائے افسانہ	1986
محمد طفیل ادبی ایوارڈ	1987
منشی پریم چند ایوارڈ	1989
بابائے اردو ہجری ایوارڈ	1991

ممتاز مفتی ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے۔ ممتاز مفتی کا اصل نام مقبول حسین تھا۔

☆.....ممتاز مفتی کی وفات کے بعد ''تلاش'' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کے بارے میں ممتاز مفتی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ یہ کتاب داتا صاحب اور سلطان باہو نے اصرار کے ساتھ لکھوائی ہے، جس کے لیے انھوں نے کتب بھی مہیا کیں اور اپنے ہرکارے بھی بھیجتے رہے۔

جناب ممتاز مفتی صاحب ایک بڑے ادیب ہیں۔ مزید مختلف شعبہ ہائے حیات کی بڑی بڑی شخصیات سے ان کی دوستیاں تھیں یہ اپنے رویہ میں بھی منفرد انسان تھے۔

11 ستمبر 1905 میں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ 25 اکتوبر 1995 کو اسلام آباد میں وفات پائی۔ عمر 90 سال ایک ماہ سے زائد پائی۔ ہوش وحواس آخری لمحہ تک قائم تھے۔ سوگواروں میں بیوی، اقبال بانو، بیٹا عکسی مفتی، بیٹیاں سویرا، نیلوفش اور سینکڑوں احباب چھوڑے۔

ممتاز مفتی کے والد مفتی محمد حسین، ماسٹر تھے۔ ممتاز مفتی کو والد سے بچپن سے ہی نفرت تھی۔ ان کے والد نے ممتاز مفتی کی والدہ کو طلاق تو نہیں دی تھی، مگر تین شادیاں اور کی تھیں جس سے ممتاز مفتی کی والدہ کی گھر میں حیثیت اک نوکرانی کی بن کر رہ گئی تھی اور اُن کی ایک نوکرانی کے بیٹے کی۔

ممتاز مفتی کی ابتدائی زندگی بڑی جدوجہد سے گزری۔ مگر جب قدرت اللہ شہاب سے تعلق قائم ہوا تو اس کے بعد سکون و آرام کا دور شروع ہوا اور ان کا اکلوتا بیٹا عکسی مفتی بھی ان کی زندگی میں بڑا افسر بن گیا۔

ممتاز مفتی نے میٹرک بٹالہ سے کیا۔ ایف اے 1921 میں ہندو سبھا کالج امرتسر سے اور بی اے 1927 میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے کیا سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بیچلر آف ٹریننگ ڈگری لی۔ 1930 کے عشرہ میں انگلش کے ٹیچر تھے۔ گورداسپور، جام پور، دھرم سالہ، خانیوال، چک جھمرہ، قصور، ساہیوال، سانگلہ ہل، گوجرہ، شیخوپورہ اور لاہور میں پڑھایا تنخواہ 45 روپے تھی۔ آل انڈیا ریڈیو لاہور کے سٹیشن ڈائریکٹر "چپ" (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور اپنا نام سلمان رکھا تھا) نے دو سو پچھتر روپے ماہوار پر ریڈیو سے سٹاف آرٹسٹ کی آفر کی ممتاز مفتی ریڈیو پر ڈرامے اور فیچر لکھنے لگے اسی دوران مشہور فلم سٹار "پرمیلا" اور "کمار" نے ممتاز مفتی سے پانچ سو روپے ماہوار پر فلمی کہانیاں لکھنے کا معاہدہ کیا اور ان کو اپنے ساتھ بمبئی لے گئے جہاں میراجی، منٹو، کرشن چندر اور بہت نامور ادیب فلمی دنیا میں موجود تھے۔ ممتاز مفتی نے وہاں "رضیہ سلطانہ" کی زندگی اور کارنامے پر مسودہ تیار کیا لیکن اس دوران ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ ستمبر 1947 میں لاہور آ گئے اور محکمہ وزارت و اطلاعات ونشریات میں ملازم ہو گئے۔ پنجاب حکومت کے رسالہ استقلال میں ادارتی معاون کے طور پر کام شروع کیا۔ پھر راولپنڈی گئے جہاں ایئر فورس میں بھرتی کے لیے سلیکشن بورڈ میں نفسیاتی مشیر بن گئے کچھ عرصہ آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل میں مسودہ نگار کی حیثیت سے بھی کام کیا راولپنڈی انفارمیشن ڈائریکٹوریٹ میں تھے تو ان پر دو کیس بن گئے ایک فراڈ کا دوسرا سکیورٹی کا۔ انکوائری ہو رہی تھی۔ ممتاز مفتی اپنے ایک مضمون "قدرت اللہ شہاب اللہ کا "007" میں لکھتے ہیں۔ "اشفاق کہنے لگا میرا اک دوست ہے جو بڑے عہدہ پر

فائز ہے اسے کہوں تیری سفارش کے لیے۔ میں نے کہا کہ اوے سفارش نو اوبجکیشن (No Objection) اس کے کچھ عرصہ بعد ایک روز وزارت کے سیکرٹری اظفر نے مجھے طلب کیا۔ اظفر نے میز کی دراز سے ایک خط نکالا۔ بولا۔ مفتی صاحب قدرت اللہ شہاب کا یہ خط مجھے آج موصول ہوا ہے اس خط میں انھوں نے لکھا ہے۔ ممتاز مفتی میرے عزیز ہیں ان کا خیال رکھیں اور مدد کریں۔ قدرت ان دنوں کراچی میں مقیم تھا۔ انکوائری آفیسر کی سفارش پر تبادلہ کراچی ہوگیا۔

جب اشفاق کراچی آیا تو زبردستی مجھے قدرت کے گھر لے گیا۔ اشفاق لاہور جانے لگا تو اس نے بہت سمجھایا کہنے لگا شہاب سے ملتے رہنا وہ بڑا اچھا آدمی ہے چند دنوں کے بعد قدرت کا فون آجاتا فلاں کام ہے اگر فرصت ہے تو میرے ساتھ چلنے یوں قدرت اور میں ملنے لگے۔ انھیں دنوں میری پے فکسیشن (Pay Fixation) کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ 1951 میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے مجھے ایک آسامی پر فائز کیا تھا مگر میری بے فکسیشن کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔

قدرت نے اس سلسلہ میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ حالات کو جاننے کے لیے وہ اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتا۔ میری پے فکسیشن کے لیے اس نے جگہ جگہ سفارش کی۔

پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی بنا تو قدرت اللہ شہاب راولپنڈی چلے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد ممتاز مفتی بھی قدرت اللہ کے اوایس ڈی بن کر راولپنڈی آگئے۔ قدرت اللہ شہاب سے تعلق نے ممتاز مفتی کی شخصیت اور سوچ میں ایک نیا رُخ پیدا کیا اور اُن کے اندر کا صوفی بھی اسی دوران باہر نکلا اور اک خاص کلاس میں پزیرائی بھی حاصل ہوئی۔

ممتاز مفتی قدرت اللہ شہاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے نہ ایسا افسر دیکھا تھا نہ انسان۔ اس سے بڑا بابا مجھے نہیں ملا۔ شہاب نے مجھے بات کو پہنچاننے کا سلیقہ بخشا۔

اس کے دم قدم سے میری زندگی آسان ہو گئی۔ دنیا جنت بن گئی۔ جس نے مجھے رُخ عطا کیا۔ کیا سے کیا بنا دیا کہاں سے کہاں لے گیا۔ مجھ پر شہاب کے بعد احسانات ہیں ایک دن شہاب بزرگی کی اہمیت پر روشنی ڈال رہا تھا۔

میں اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا اور کہا شہاب خدا کے لیے مجھے گدھا بنا دو بزرگ نہ بنانا (ممتاز مفتی کے خیال میں قدرت کو یہ قدرت حاصل تھی کہ جس کو جو جی چاہے بنا دے) ممتاز مفتی کے نزدیک قدرت اللہ شہاب کا مقام پیغمبر ابراہیمی تھا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں ممتاز مفتی کہا کرتا تھا شہاب کا ادب کیا کرو یہ کسی اور جہت کا آدمی ہے۔ ایسے لوگ وقت آنے پر رشتے

بھول کر رسی اور چھری لے کر بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے افسانے اور ناول ادب کے اک قاری کی حیثیت سے میں نے پڑھے لیکن اُن کی تحریر میں وہ گرفت اور فکر کی بالیدگی جو قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، غلام عباس، شوکت صدیقی، عصمت چغتائی کے افسانوں یا ناولوں میں ملتی ہے، نہیں ہے۔

ممتاز مفتی کا ناول علی پور کا ایلی جو 1961 میں شائع ہوا تھا۔ اُس کو اس وقت اردو کا ضخیم ناول کا درجہ دیا گیا جبکہ ''آدم جی ایوارڈ'' کے لیے مسترد کر دیا گیا تھا (کمیٹی نے اُسے مسترد کر دیا تھا۔ مسترد کرنے والے بورڈ میں اشفاق احمد بھی شامل تھے) ممتاز مفتی کی سوانح لکھنے والے اس ناول کا ذکر اور تعریف بہت کرتے ہیں اس بارے میں میرا یقین ہے بیشتر نے اس ناول کو پڑھا ہی نہیں۔ چیدہ چیدہ دیکھا ہوگا۔ اخبار پاکستان لاہور میں 11/11/95 کو ممتاز مفتی کا انٹرویو چھپا۔ جو جاوید چودھری نے ان سے ڈیڑھ سال قبل لیا تھا اور وفات کے بعد شائع کیا اور ایک کتاب ''علی پور کا مفتی'' پروفیسر احمد عقیل روبی نے ممتاز مفتی کی وفات سے کچھ دن قبل شائع کی اس کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت بھی ممتاز مفتی نے کی تھی۔ احمد عقیل روبی کی کتاب کی ادبی حیثیت کے بارے میں عطاالحق قاسمی نے اخبار نوائے وقت کے 9/01/96 کے ادبی ایڈیشن میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''یہ ایک کمزور کتاب ہے جو خاکہ کم اور کرامات کا اشتہار زیادہ بن گئی ہے۔ چنانچہ میرا مقصد اس کتاب کا تجزیہ کرنا نہیں بلکہ ممتاز مفتی کی شخصیت پر عرض کرنا ہے لہٰذا انٹرویو اور علی پور کا مفتی مزید قریب کے لوگوں کی باتیں سُن کر ممتاز مفتی کی شخصیت کا جو تاثر اُبھرتا ہے وہ اک ایسے آدمی کا ہے، جس کی چھٹی حس سودمند تجزیہ کا اور اک رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، جس نے زندگی کے گرم سرد کو محسوس کیا اور اس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانے کا سلیقہ اس میں موجود ہے۔ جو الفاظ کے اسرار و رموز کی اہمیت کو سمجھتا ہے، جس کی زبان دانی میں چسکی بھی ہے اور سسکی بھی، جس کے جملوں اور باتوں میں لیس دار لذت پائی جاتی ہے۔ جو تعریف کی طاقت کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور اُس کو استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے جو فرد کی کمزوریوں اور ضرورتوں اور مسائل کو اپنی چھٹی حس کی مدد سے محسوس کر کے اک پیر کا طرح اُن پر واشگاف کرتا ہے جیسا کہ یہ اک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں پڑھے لکھے مرد اور عورتوں کا اک گروہ ایسا موجود ہوتا ہے جو دوہرے چہرے اور چالاک ذہن کا حامل ہوتا ہے ان کا وطیرہ، اقدار، روایت کو توڑنا

حلال وحرام، مذہب، وطنیت کو وسیع تناظر کا نام دے کر اپنے مفادات کی نظر سے توجیح کرنا۔ ترقی پسندی کے نام پر آزاد زندگی گزارنا عیش وعشرت آرام۔ اعلیٰ خوشحال زندگی گزارنا اپنا حق سمجھنا اور اس کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانا پڑے تو چلے جانا۔ اِن پڑھے لکھے صاحب عقل، صاحب علم، صاحب اثر لوگوں کو ذرائع ابلاغ میں بھی رسائی ہوتی ہے اور دربار حکومت سے بھی تعلق رکھتے ہیں ان مختلف مگر مشترکہ مفاد رکھنے والوں لوگوں کے ڈیرے کو ''انجمن مفادات باہمی'' کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی نجی زندگی کے تحفظ۔ مفادات کے حصول اور شہرت کے لیے ایک مرکزیت اور ایک مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرشد عام طور پر کم گریڈ کم حیثیت کا ہوتا ہے لیکن ذہانت اور کلام میں۔ کائنا۔

ممتاز مفتی کے انٹرویو سے مختصراً ارشادات پیش ہیں:

☆ آجکل میرا ایک پندرہ سالہ لڑکی سے چکر چل رہا ہے۔

☆ زیادہ اللہ اللہ نہ کریں اس نے چھاڈال لیا تو کہیں کے نہ رہیں گے۔

☆ اور پیغام آگیا کہ اب تصوف پر کتاب لکھو۔ اپنی زندگی کی آخری کتاب تو میں ہنس پڑا۔ کہاں تصوف کہاں ممتاز مفتی۔ اسلام کے بارے میں میری معلومات اس سے زیادہ نہیں کہ اللہ اور نبی کا بار بار ذکر آتا ہے اور یہ س۔ل۔م سے بنا ہے۔ میں نے پیغام کو پیغام رساں کی غلطی سمجھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد دروازے پر ایک لمبی داڑھی اور اونچی پگڑ والے بزرگ آگئے۔ کتابوں سے بھرا تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑا کر کہنے لگے آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں یہ کتابیں آپ کو اس سلسلہ میں راہنمائی دیں گی میں نے کہا یا حیرت یہ کیا تماشا ہے پھر آگے پیچھے پیغام کی بھرمار ہو گی۔ سخی سلطان باہو نے بندہ بھیج دیا داتا صاحب کے ہرکارے بھی پہنچ گئے۔ داتا صاحب اور سلطان باہو نے کہا یہ کتاب لکھو گے تو چھٹی ہوگی۔

☆ میں جنت میں جانا بالکل پسند نہیں کروں گا۔ مجھے اللہ کی جنت سے بہت اختلاف ہے۔

☆ اشفاق احمد پچاس برس سے میرا یار ہے وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے وہ قابل ہے لیکن اس کے بچے اس سے زیادہ قابل ہیں (مفتی صاحب نے اُن قابل بچوں کے نام نہیں بتائے)

☆ میں بانو کی بہت عزت کرتا ہوں وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے لیکن میری ماں ہے میں اس کے بغیر بالکل یتیم ہوں۔

☆ اس میں (قدرت اللہ شہاب) جنسِ مخالف کے لیے کوئی کشش نہیں تھی لیکن اس کے باوجود خواتین اس میں دلچسپی لیتی تھیں۔

اب احمد عقیل روبی کی کتاب ''علی پور کا

مفتی" کے ڈرائنگ روم کی کچھ گفتگو۔

☆ یہ روبی کیا نام ہے؟ یہ نام تو گاؤں میں رہنے والی کرستان لڑکیاں رکھتی ہیں جو شلجم کو گونگلو کہتی ہیں یا ریڈ لائٹ ایریا والیاں جو تین سے 6 فلم شو میں گاہک پھانسنے جاتی ہیں۔ ایک پل رک کر مجھ سے رازدارانہ انداز میں اپنی آنکھ دبا کر پوچھا تم ہوموسیکس تو نہیں۔

☆ حسینہ ادب نے مجھے سالگرہ پر مبارک باد دی ہے مفتی خوش ہو کر بولے سجاد حیدر کا خط ہے بیوقوف آپ نہیں آیا۔ خط بھیج دیا۔ چلو تینوں افسوس ہویا ہونا ایں کڑی سمجھ کے خط کھولیا سی وچوں منڈا نکل آیا۔ اشفاق احمد بولے سجاد حیدر بھی تو لڑکی ہی ہے لڑکوں والی کون سی بات ہے اس میں۔

☆ کرنل طارق کی بیوی نے کہا اور اب آپ پھر جوان لڑکوں کی طرح چہک رہے ہیں۔ اسی دوران ممتاز مفتی کی بیوی اندر داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔ نبی اللہ دا واسطہ ہن اینو بڈھا ہو لین دیو۔

ایک خاتون جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی تھیں کہنے لگیں۔ مفتی جی جوان رہن تے تہاڈا۔ فائدہ ای فائدہ اے..... مینوں کوئی فائدہ نہیں۔ میں تے نقصان ای نقصان ویکھیا اے___ ممتاز مفتی کی بیوی نے ہنس کر کہا اور گلاس لے کر اندر چلی گئی۔

☆ اس دوران شبنم شکیل اندر آ گئیں۔ سفید کپڑوں میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میں یہ بات اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن ممتاز مفتی نے اسے دیکھ کر فوراً کہا___ تُوں اَج بہت سوہنی لگ رہی ایں کڑیے۔

چھوڑیئے مفتی صاحب آپ نے یہ فقرہ دن میں نہ جانے کس کس کو کہا ہوگا۔ بالکل نہیں۔ کوئی اج تیرے علاوہ آیا ای نہیں۔

جب شبنم صوفے پر بیٹھ گئیں تو اس کی طرف منہ کر کے کہنے لگے خلم میری پیاری 17 سال کی خوبصورت سمارٹ بال کھلے قمیض کا گریبان آگے سے نیچے تک کھلا گورے رنگ کی لڑکی ہو یا شبنم شکیل۔ مفتی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں سب پیاریوں کا مقام رکھتی ہیں اور مفتی اُن سب کو پیاری کہہ کر بلاتے ہیں۔ ممتاز مفتی عورتوں لڑکیوں نوعمر جنسِ مخالف کا گنگا گھاٹ ہے۔ جہاں یہ سب آتی ہیں اور اپنے اپنے مسائل کے چیتھڑے دھو کر مفتی کے مشوروں کی دھوپ میں سکھاتی ہیں اور ساتھ میں استعمال کے لیے ہومیوپیتھک کی پڑیا بھی لیتی ہیں۔ وہ لڑکے لڑکیوں کی کلاس لیتا ہے اور اُن کو تخیلاتی الف لیلیٰ سناتا ہے وہ ہر قسم کی گفتگو سنتا ہے جنس سے لے کر روحانیت تک کی۔ بات کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ نتیجہ اخذ کرتا ہے اور مسئلے کا حل نکالتا ہے۔ ممتاز مفتی کے دوستوں اور سہیلیوں میں ہر عمر ہر قسم کے مرد اور عورتیں لڑکے اور لڑکیاں حلقۂ عقیدت میں شامل ہیں۔ ممتاز مفتی کے نزدیک پاکستانی ادیبوں اور شاعروں میں

صرف ایک آدمی ایسا ہے جس کو شہرت جینون (Genuine) ملی وہ تھے فیض احمد فیض اور بقول ممتاز مفتی، ساری زندگی میں نے اک آدمی سے شدید نفرت کی۔ نہ اس نے مجھے کبھی نقصان پہنچایا نہ کوئی بات کی۔ بس مجھے اس نے خدا واسطے کا بھیر تھا وہ ہیں احمد ندیم قاسمی۔

ممتاز مفتی نے اس دکھ کو جو اس نے بچپن سے ہی سہا اور جس کی وجہ سے وہ باپ سے نفرت کرتا رہا یعنی سوتیلی ماں کا اس روایت کو ممتاز مفتی نے اور اُس کے اکلوتے بیٹے عکسی مفتی نے دو دو شادیاں کر کے قائم رکھا ممتاز مفتی لڑکیوں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کو ان کی ایسی صلاحیتوں سے جن سے وہ خود بھی ناواقف ہوتیں اُن پر منکشف کرتے تھے اور گفتگو میں جنسی لذت کا ایسا تڑکا لگاتے کہ خمار بے پئے ہو جائے۔

ممتاز مفتی سے ایک خاتون دوبارہ ملنے آئیں تو مفتی نے خاتون سے فرمایا تمھارے بدن میں ایسا نور ہے جو تمھارے جانے کے بعد سارے کمرے میں پھیل گیا تھا اور میں تمام رات اُس سے لپٹ کر لیٹا رہا۔

نامور صحافی احمد بشیر کی ممتاز مفتی سے اکیاون سال کی دوستی تھی۔ اس دوران احمد بشیر نے ممتاز مفتی پر دو تین خاکے اور تین چار ضمنیاں لکھیں اس اکیاون سالہ دوست احمد بشیر کی تحریر سے اقتباسات:

☆ ..... اللہ کو خوش کرنے کے لیے رسمی عبادت اُس نے کبھی نہ کی۔ کبھی کبھی پانچ پیسے جب اُس میں قوت خرید تھی پھر پانچ آنے جب ان میں قوت خرید تھی پھر پانچ روپے نیاز وہ دیتا، مگر نماز روزے سے وہ آزاد تھا وہ حج پر ضرور گیا مگر اُس نے وہاں باقاعدگی سے نماز پڑھی اور کپڑے پاک رکھے تو اس کی وجہ قدرت اللہ شہاب کی رفاقت ہوگی جیسے وہ خدا کا رازداں قطب القطاب اور مہدی موعود کا مقام دیتا تھا۔

☆ ..... حسین لڑکیاں اُس کے پاس بہت آتی ہیں وہ محبتوں کی ماری ہوتی ہیں یا محرموں کی ماری یا ماں باپ کی ماری یا افسروں کی ماری ہوئی یا تنہائی کی ماری ہوئی۔

ممتاز مفتی عورتوں کو اپنے سفید پروں پر بٹھا کر اسی ورلڈ آف میکسیلف کی سیر کرواتا ہے وہ بڑھاپے کی وجہ سے خطرناک نہیں لگتا اُس کے مطالبے حد سے نہیں نکلتے حالانکہ جذباتی طور پر وہ اک منہ زور بُراق ہے عورت اس پر جب سواری کرتی ہے تو اُسے ساتوں رنگ ساتوں سُر اپنے بے شمار امتزاجوں کے دھند میں چھپا لیتے ہیں۔

ممتاز مفتی نے بھی احمد بشیر کا خاکہ لکھا ہے یہ خاکہ اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے اس میں ممتاز مفتی نے جنسی جبلّت پر اظہار رائے کیا ہے۔ ممتاز مفتی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

☆ ..... عام طور پر ادیب کی جنسی خواہش کا مرکز جسم نہیں ہوتا ذہن ہوتا ہے وہ اپنے ذہن کی دھونکنی جلا کر بڑی محنت سے جسم

گرماتے ہیں۔ عام طور پر اس عمل میں خواہش کی شدت مخصوص عضو پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ سارے جسم میں منتشر ہوتی ہے۔

☆..... پیر مغاں (زیڈ اے بخاری) نے مسرور کن نگاہوں سے احمد بشیر کی طرف دیکھا امرد پرستی کے فلسفے کو جانتے ہو؟

جانتا ہوں، مانتا ہوں (احمد بشیر)

سبھی مانتے ہیں صوفی، فقیر، ادیب، شاعر، ایکٹر، موسیقار، تم کیا چیز ہو؟

عورت کی محبت تو صرف پیداواری محبت ہے عام لوگوں کا مشغلہ۔!

☆..... احمد بشیر کی والدہ جگنو نہیں دیپک تھیں ان کی خواہش تھی کہ کوئی اُنھیں جلا کر بھسم کر ڈالے یا وہ خود کسی کو جلا کر راکھ کر دیں۔

شیخ غلام حسین (والد) کی ٹھنڈی مٹی میں نہ جلنے کی قوت تھی اور نہ اُن کے نورانی شعلے میں جلا کر بھسم کرنے کی!

☆..... بی اے کرنے کے بعد پہلی دفعہ نوکری کی جو اُسے فوج میں ملی تو سویلین آفیسر کی تھی ان کا کمانڈنٹ ایک معمر کرنیل تھا۔ کرنیل صاحب کی دو نوخیز بیٹیاں تھیں دونوں احمد بشیر پر رنجہ گئیں اُن کا مطالبہ تھا جوانوں کی تفریح کا سامان کرنے سے پہلے اُنہیں انٹرٹین کیا جائے شاید گزارہ ہو جاتا لیکن کرنیل صاحب کی جوان بیوی نے لندن سے آ کر جلتی پر تیل ڈال دیا اور اس پر مصر ہو گئی کہ اس کھیل میں اُسے بھی شامل کیا جائے۔

☆..... دوسری عورت جس سے احمد بشیر کو شدت سے لگاؤ ہے اُس کی چھوٹی بہن پروین ہے دونوں کو ایک دوسرے سے عشق ہے۔

ممتاز مفتی یا اس طرح کے دوسرے لکھنے والوں ادیبوں کے ان افکار سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی فکری رسی اُن کے نفس سے بندھی ہوتی ہے رشتہ کتنا بھی محترم ہو یہ ہر رشتہ کو اسی رسی پر نچاتے ہیں۔ مزید ان کی مریدنیاں اور مریدان کے ان فقروں سے ہی 'قوتِ باہ' کا ٹانک کشید کرتے ہیں۔ یہ ٹانک جوان کے جسم کے اندر چنگاریوں کو سلگائے رکھتا ہے اور ذہنی طور پر اُن کو ہر عمر میں جوان رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

محمد حنیف

نیلما درانی ..... بزیر شاخ گل

جیسا کہ سب جانتے ہیں نیلما درانی معروف ومقبول شاعرہ ہیں۔ ہمارا ان سے تعارف جب ہونا چاہیے تھا تب نہیں ہوا یعنی ہوائے گُل والے زمانوں میں یہ بھی سمن آباد میں رہتی تھیں اور ہم بھی اس بستی کے باسی تھے ۔ جیسے جیسے ان کی تصنیف تیز ہوا کا شہر'' ہم پڑھتے گئے ان سے وہ تعارف ہوتا گیا جو بوجوہ پچھلے زمانوں میں نہ ہو سکا تھا۔ ہم ان دنوں فلمی دنیا میں باریابی کے لیے نابغہ روز گار اے حمید صاحب سے بھی ملا کرتے تھے اور وزیر افضل سے بھی۔ ظاہر ہے جدوجہد کے دن تھے ۔ نیلما درانی سے بھی ہماری پہلی ملاقات موسیقی کے ایک بڑے پروگرام میں ہوئی۔ یہ پروگرام ہمارے سٹیٹ بینک کے دنوں کے نستعلیق اور ملنسار دوست نے ترتیب دیا تھا۔

ہماری لاہور میں موجودگی کا سن کر انھوں نے بڑی محبت سے مدعو کیا۔ یہ دعوت ہم پر ان کا ایک اور احسان ثابت ہوئی کیونکہ پروگرام میں ہماری نیلما جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ نیلما بے تکان مسکراتی ہوئی،

جمشید مسرور

خوش مزاج اور لطیف تھیں۔ ابھی ہم اسی احساس میں تھے کہ فوراً ہی کسی بدخواہ نے ہمارے کان میں سرگوشی کی۔ یہ صرف شاعرہ ہی نہیں ہیں پولیس افسر بھی ہیں ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ شاعرہ اور پولیس افسر! ہمیں وہم سا ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ نوکری شاعری کو لے ڈوبے یا شاعری نوکری کو یا دونوں ہی ایک دوسرے کو۔ بعد میں یہ وہم غلط ثابت ہوا۔

نیلما جی کی دبی دبی مسکراہٹ ہمیشہ ان کے ساتھ رہی اور پاکیزہ دوستی کے حوالے سے ہمارے ساتھ بھی۔ ان کا لطیف تکلم تو عادی مجرموں کو بھی امام مسجد بنا دیتا ہوگا۔ اگر شرافت کا کوئی اپنا اظہار ہو تو وہ نیلما درانی ہیں۔

نیلما صرف شاعرہ ہوتیں تو خیر تھی۔ ان کی چند غزلیں پڑھ کر ان پر کوئی ایک مبسوط مضمون تحریر کر دیتا۔ لیکن یہاں تو بکھرے ہوئے رنگوں کی ایک بے کراں بہار ہے۔ ان کا وجود یک رنگا کبوتر نہیں کہ کوئی بھی پکڑ کر کسی چھتری پر بٹھا لے۔ بے شمار رنگ برنگے اڑتے کبوتر ہیں۔

شاعر، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، خاکہ نگار ہی نہیں اینکر بھی ہیں۔

چنانچہ ایک ٹی وی کے لیے کبھی انھوں نے میڈم نشو کے ہمراہ ہمارا انٹرویو بھی کیا تھا۔

ایک اور لاہور یاترا پر کچھ ایسا ہوا کہ ہمیں محکمہ پولیس سے ایک کام پڑ گیا۔ بڑی خواری کے بعد بھی جب ہماری کوئی شنوائی نہ ہو سکی تو ہم نے بالآخر ایس ایس پی لاہور کو فون کیا۔ یہ نیلما درانی تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ آپ کو کوئی جسمانی زک تو نہیں پہنچی یہ شاعرہ نیلما درانی تھیں۔

اگلے ہی لمحے ہم پولیس والوں کی آنکھ کا تارہ بن گئے۔ ہمیں چائے اور بسکٹ بھی پیش کیے گئے اور وڈے تھانیدار صاحب کے دفتر میں باعزت باریابی بھی حاصل ہوئی۔ وہیں کہیں سے شعیب بن عزیز صاحب کا بھی ہمیں فون آ گیا جو ہماری تلاش میں تھے اب اگلا مرحلہ تھانے میں صرف گارڈ آف آنر ملنے کا رہ گیا تھا۔

نیلما سولہ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان کی اردو اور پنجابی شاعری متاثر کن اور دل موہ لینے والی ہے۔

اداس لوگوں سے پیار کرنا کوئی تو سیکھے انھی کی غزل ہے اور ''راستے میں گلاب رکھے ہیں'' ان کے ایک شعری مجموعے کا نام ہے۔

نیلما عادتاً متین، مہذب اور نرم خو ہیں۔ انھوں نے کچھ مشاہیر کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ مشیر کاظمی (مرحوم) کا نام پڑھ کر ہمیں بھی کچھ گزرے زمانے یاد آئے۔ تب وہ

ایک شفیق بزرگ تھے اور ہمارے ساتھ بھی شفقت سے پیش آتے تھے۔

نیلما اردو ادب کی ایک موج ہیں اور اس موج کو نیلے پانیوں اور سفید ساحلوں کو دیکھنے کے لیے بے شمار مواقع ملے ہیں۔ جس کے لیے خوش قسمت ہونے کے علاوہ شوق فضول اور جرأت رندانہ بھی ضروری ہیں۔ انھوں نے سترہ ممالک کی سیر اور فارسی، صحافت اور پنجابی میں تین ایم اے بھی کر رکھے ہیں۔ گورنر پنجاب سے فاطمہ جناح میڈل برائے شاعری اور وزیر اعظم پاکستان سے گولڈ میڈل برائے اعلیٰ کارکردگی محکمہ پولیس لے رکھے ہیں۔

زمانے کی اسی سیر میں یہ عالمی مشاعروں میں ہمارے پاس بھی دو دفعہ تشریف لائیں۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ معروف فنکارہ اور فن کا بیش قیمت سرمایہ محترمہ زریں پنا بھی ہماری مہمان تھیں۔

2007 کے مشاعرے میں ایک نارویجن شاعرہ نے ایک عجیب نظم سنائی۔ سننے والوں کا یہ حال ہوا تو نظم لکھتے ہوئے اس شاعرہ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ یہ نظم نیلما درانی کی پسندیدہ ترین نظم ہے:

یاسمین کی جھاڑیوں سے
جون کی برف گرتی ہے
تو میں سوچتی ہوں
اگلے برس شاید ہم اکٹھے ہوں یا نہ ہوں
ہم میں پیار ہو یا نہ ہو
یا ہم دوست بھی ہوں یا نہ ہوں

.....

ہم بھی اسی شاعرہ کے بڑے مداح تھے۔

وہ بہت سیلانی تھی اور سمندروں، پہاڑوں، جنگلوں اور ہواؤں کے تعاقب میں رہتی تھی۔

نیلما جی کے ساتھ ہم نے سوڈان بھی دیکھنا تھا، دریائے نیل بھی اور وہ مقام بھی جہاں موسیٰ اور خضر کی ملاقات ہوئی تھی۔ نیل کے پانیوں کو تو ہم چھو آئے باقی پھر کبھی.....

نیلما درانی سے ہماری جب بھی ملاقات ہوئی ہمیں کہیں نہ کہیں اردگرد بکھری ہوئی اداسی نظر آئی۔ یوں لگا ہمارے سامنے، ہمارے پاس پُرسکون سطح والا کوئی وسیع سمندر ہے جس کے نیچے طوفان چھپے ہیں۔ یہ ویسا ہی احساس تھا جو ہمیں Agnese کے ساتھ ریگا کے ساحل جُرمالا پر کنارے کی طرف دوڑتی نہ تھکنے والی موجوں کو دیکھ کر ہوا تھا۔

اداسیوں کے حوالے سے - شاید اس مصرعے سے نیلما درانی کا کوئی تعلق ہو:

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را

☆☆☆☆☆

کس کا جہنم

میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس جس پر لفظ ''ملبوس'' بھی پھبتی کی طرح لگتا ہے- ایلومنیم کے برتن جن میں کلونس دور سے صاف نظر آ رہی ہے - اپنے ہاتھ سے جن کے ناخن اُنگلیوں سے بھی پہلے کھانے تک پہنچتے ہیں، کچھ کھا رہے ہیں بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ضرور کوئی میٹھی چیز ہوگی- ساتھ ہی اونچے چوبی تخت پر سامان سجائے قتلمے، کچوریاں بنانے والے مزار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اُس کے قریب قصبوں، دیہاتوں میں چلنے والی دوتین لاریاں کھڑی تھیں، جن کے نقش ونگار کے درمیان جنوبی پنجاب کے شہر کا نام لکھا تھا- اوہ! تو یہ لوگ اتنی دور سے آئے ہیں - میرے کانوں میں گھروں سے رخصت ہوتے ہوئے لاری میں سفر کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی آوازیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں:

تُوں فکر نہ کر تیرے واسطے وی دعا منگ ساں
(تو فکر نہ کر تیرے لیے بھی دعا مانگوں گا)

اوئے جنّتے توں نہگھابر، نکّی دا ویاہ ہوسی، میں پیر ہوراں نُوں آپ کہواں گا- ہتھ جوڑ کے کہواں گا (اے جنّتے تُو نہ گھبرا تیری بیٹی کی شادی ضرور ہوگی میں پیر جی کو آپ کہوں گا- ہاتھ جوڑ کے کہوں گا)

اوئے نُور بھریئے یتمیڑی جہیا مبنہ نہ بنا اوئے گواچا چھور آؤ گا وت کیویں نہ آؤ گا (اے نور بھریئے یتیم جیسا منہ نہ بنا گمشدہ بیٹا ضرور آئے گا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ نہ آئے)

من ہی من میں ہزاروں دعائیں مانگتے ہوئے دعا کے لیے اُٹھتے ہوئے کانپتے ہاتھ- تعلیم کی کمی، رزق کی کمی نے کیسے کیسے آستانے بنالیے ہیں خوراک یادوا کے لیے بھلے پیسے نہ بچیں- چڑھاوا تو چڑھانا ہے اور اگر یہ آستانہ بھی نہ ہو تو خُدا تک اُن کی آرزوئیں- تمنائیں- خواہشیں کیسے پہنچیں- کوئی تو ہے جسے وہ سب کچھ کہہ سکتے ہیں سنا سکتے ہیں- آس اُمید لگا سکتے ہیں- عقیدت میں لپٹی آرزوئیں، ایک طرف مگر اُس نے دعاؤں پہ جو یقین پیدا کیا وہ ہمیں عمل سے اتنی دور لے گیا کہ ہم نے تمام کاروبارِ زندگی دعاؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا (جنت میں جانے کا شارٹ کٹ)

اقبال خان یوسف زئی

دعائیں میلوں لمبی ہو گئی ہیں
عمل اب مختصر سے ہو گئے ہیں

.....

مگر اس نے ہماری عام زندگی میں کیا انقلاب برپا کیا۔ پہلے تو عامل کامل اور بنگالی بابا پیدا ہوئے جنھوں نے پیشانی پر بورڈ لگا کر لکھا۔ اپنے نام کی کمیٹی نکلوائیں ۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آئی کہ اگر دو آدمی اپنے نام کی کمیٹی پر اصرار کریں تو عامل صاحب۔ کیا کریں گے کیا ایک کو اپنے پاس سے کمیٹی دیدیں گے۔

دوسری محبوب آپ کے قدموں میں (یعنی آپ کا ہو جائے گا) ایک لڑکی کے دو چاہنے والے ہوں تو کیا نصف نصف بانٹ دی جائے گی۔

پھر فقیر مافیا پیدا ہوا جس نے انسان کی ایسی حس کو کیش کرایا جو اُسے معذور، مجبور، بے بس اور لاچار نظر آنے پر اُس کی مدد پر اُکساتی ہے۔ باقاعدہ جگہیں فروخت کی جاتی ہیں جہاں مُنہ اندھیرے اُنھیں وہاں لڑھکا دیا جاتا ہے اُن کی معذوری اُنھیں ازخود وہاں نہیں لاسکتی۔

انسانی طمع اور لالچ نے ماؤں کی گود سے معذور بنانے کے لیے نہ جانے کتنے بچے چھین لیے۔ سوا نگ رچایا جاتا ہے باقاعدہ دعائیں رٹائی جاتی ہیں کہ کتنی عمر کے مردوں اور عورتوں کے سامنے کس طرح دعاؤں کا پشتارہ کھولنا ہے جو اُن کے ہاتھ کو جیب تک لیجانے پر مجبور کر دے۔ بعض 'فنکاروں' پر معذوری کا 'میک اپ' بھی کیا جاتا ہے۔ دن بہ دن مانگنے والوں کی تعداد بڑھتی یا بڑھائی جارہی ہے۔ گویا 'انڈسٹری' ترقی کر رہی ہے۔ مصروف شاہراؤں کا شاید ہی کوئی چوک باقی بچا ہو۔ مانگنا شاید "فنکاری" بن گیا ہے۔ برائی نہیں۔ میں سوچتا ہوں ایک تکون ہے ۔ نسل۔ تربیت۔ اور ماحول اِس ترتیب میں زیر زبر ہو جائے تو انسان اچھا یا بُرا بن جاتا ہے یوں بھی ہوتا ہے میری نظر میں جو اچھائی ہے وہ کسی اور کی نظر میں خامی ہو ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اچھا سمجھ کر کرتا ہے (خواہ وہ بُرا ہی کیوں نہ ہو)

مادیت آسائش تو مہیا کرتی ہے۔ سکون نہیں۔ لیکن یہ سکون کیا ہے؟ کیا سکون صبر اور شکر میں ہے؟

یہ تمام تر لطافتیں، قوس وقزح کے رنگ پھول، تتلیاں، بارش کی رم جھم، پرندوں کی چہچہاہٹ دنیا کے حسین شہروں میں بسنے والے چہروں کی شادابی، خوشی، خوشحالی جن کے انگ انگ سے پھوٹتی ہے اُن میں رہنے والے ہزاروں نت نئی ایجادات میں دن رات لگے ہوئے ہیں دنیا کو حسین سے حسین تر بنانے میں مادی اشیا یعنی آسانیوں کے انبار لگائے ہوئے ہوائی جہاز، بُلٹ ٹرین کے سفر میں خوبصورت جزیروں، وادیوں کی سیر کرتے ہوئے آسودہ حال مرد وزن شاپنگ پلازوں میں اپنی چاہت تمنا کے مطابق یا اُس سے کم خریداری کرتے ہوئے سمندر کی پہنائیوں پہاڑوں کی بلندیوں اور اُن سے بھی

اوپر جانے والے کھوجیوں کا اِک ہجوم یہاں
صبر و شکر کے شیدا یا با امرِ مجبوری بوسیدہ میلے
کچیلے کپڑوں سے (اگر انھیں کپڑے کہا
جا سکے) بدبو کے بھبکارے پھوٹتے ہوئے،
مچھروں، مکھیوں اور غلاظت سے سمجھوتہ کئے
ہوئے اُسی کو رضائے الٰہی مانتے ہوئے
لڑکیوں کے سکولوں کو آگ لگاتے ہوئے۔
باریک کپڑے کے تھانوں کو نذرِ آتش کرنے کو
نیکی۔ اپنے جیسے انسانوں کو ہم وطنوں کو اذیت
اور سفاکی کے ساتھ بارود کے جلانے والوں
نے کتنے ہزاروں خاندانوں میں صفِ ماتم بچھا
دی ہے۔ آہوں سسکیوں آنسوؤں کے ساتھ
بین کرتی ہوئی عورتوں کے توے:
نہ کوئی مسجد بچی ہے یارو نہ کوئی محفوظ آشیانہ
بس اک تسلسل سے چل رہا ہے انسانی بموں کا یہ کارخانہ

.....

مڈل ایسٹ اور برصغیر کی انتہائی گرمی میں
بدمست تو وہیں ٹھنڈے ملکوں کے سائنس
دانوں کی ایجادات سے اپنے گھروں کو ٹھنڈا
کرنے والوں نے بجلی کا پنکھا تک ایجاد نہ کیا
شاید اُس کی یہ بھی وجہ ہو کہ جہالت کو اوڑھنا
بچھونا بنانے والوں نے معجزوں کو ایجادات پر
ترجیح دی۔ پاسٹ گلوری کی جھوٹی سچی کہانیوں
سے اپنے سروں کو فخر سے تانے ہوئے محض
دعاؤں کو نصیبِ جاں، عمل کو وبالِ جاں جانتے
اور مانتے ہیں۔ نہ علم نہ جستجو نہ کوئی ایجاد۔
پورا عالمِ اسلام خصوصاً جہاں سیال سونا بہتا ہے
اُن کے عشرت کدے سڑکیں گلیاں بازار
عمارات بھی غیروں کی بنائی ہوئی ایجادات اور
ٹیکنالوجی کے مرہونِ منت ہیں حتیٰ کہ وہ سیال
سونا بھی جس نے اُن کی معیشت میں انقلاب
برپا کیا اُن کی بنائی ہوئی مشینری ٹیکنیک کی
مقروض ہیں۔ اس دنیا کو بنانے سنوارنے میں
ہمارا اپنا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔
علم و حکمت عقلیت کے بجائے باطل اعتقاد
تعصب توہم پرستی اور جہالت کے سمندر
میں غوطہ زن جنھیں راہِ راست پر لانے کے
لیے پیغمبر اوتار ولی تو اِس سرزمین پر پیدا
ہوئے مگر سائنس و حکمت کا کوئی بڑا کارنامہ
اس خطے کے باسیوں کو نصیب نہ ہوا۔
سنگلاخ سرزمین کا وہ خطہ جہاں موجودہ اعداد و
شمار کی روشنی میں 80% ہیروئن بنائی جا رہی
ہے۔ نوجوانوں کی رگوں میں اندھیرا اُتارنے
والے یہ روشن دماغ البتہ یہ کہتے ضرور نظر آئے
کہ اگر انھیں اجازت مل جائے تو ہیروئن کی کمائی
سے وہ اس ملک کا قرضہ اُتار دیں گے۔
کوئی اُن سے پوچھے جہاں جہاں یہ ہیروئن
پہنچے گی پکے گی وہاں کے نوجوان کیا درختوں
سے اُگتے ہیں؟ لاکھوں ماؤں کی آہیں اُن کی
گریہ زاری بے بسی ایسے لوگوں کی درندہ
صفت بے حسی کے سامنے ایک دل پسند کھیل
ہے۔ اگر اُن کا بچہ دھواں بن جائے تو یہ سوچ
کر ہی دل دہل جاتا ہے، مگر اُن کے جسم میں
دل کے بجائے کوئی سنگلاخ پتھر ہے نہ دھڑکتا
ہے نہ پھڑکتا ہے نہ رحم کھاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے
"تشبیب" کا فکری، اکتشافی و عددی مطالعہ

خالد احمد کی قصائد پر مشتمل کتاب تشبیب جو 1984 میں شائع ہوئی، جس پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر محترمہ سیدہ آیت گیلانی نے جس قدر باریک بینی اور دانش مندی اس مجموعہ کلام پر اظہار خیال کیا وہ یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ ہم سیدہ آیت گیلانی کے اس طویل مقالے کو قسطوں میں شائع کریں گے تا کہ ادب کے عام قاری تک بھی یہ تنقیدی جائزہ پہنچ سکے۔ [ادارہ]

ادب حیات کے ہر رخ کا آئینہ اور جمال کا شاہد ہے۔ ایسا آئینہ جس کے ہر زاویے، تاب اور عکس کا مزاج بشری فکر و ادارک کے ساتھ ساتھ اس کے عقیدے و نظریے سے مشروط ہے۔ نعت بھی ادراک اور ایمان سے لبریز ایک ایسی ہی صنف کا نام ہے جو معرفت کی لوحِ معراج پر رقم ہوتی ہے چونکہ جسمِ کبریا کی روح اسمِ مصطفیٰ ہے اس لیے پہلا نعت خواں خود خدا ہے۔ جس نے اُم الکتاب کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات کو "بائے بسم اللہ" کی ب

سیدہ آیت گیلانی

سے لے کر "والناس" کی س تک مجسم نعت بنا دیا۔ عالمین کے علم نے جب آیات کے باطن میں جھانکا ہر حرف قرآن کو احمدؐ، محمودؐ، محمدؐ کی نعت خوانی میں مشغول پایا۔ چونکہ نعتِ مصطفیٰ بے دل کے دل کی دھڑکنوں کی وحی ہے۔ اس لیے کبریا اپنی بے مثل کریمی سے جن لوگوں کو اس سعادت کے لیے اصطفی کرتا ہے انہیں قلمِ شیریں اور سخنِ زریں کا ایسا نایاب خزانہ ودیعت فرماتا ہے کہ ان کی زبانیں محبوبِ یزداں کے اسم و صفات کی تلاوت کرتے ہوئے وقفِ نعت رسولؐ ہو جاتی ہیں۔

اُردو زبان وادب میں حمد ونعت کی روایات عربی اور فارسی زبانوں سے آئی ہیں اور ادب وشعر کا قرینہ عربی زبان کی عطا ہے، فخرِ موجودات حضرت محمدؐ کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے عربی زبان میں مختلف قبائل کے درمیان زبان دانی کا سلسلہ یوں تھا کہ ان کے شعراء فی البدیہہ ہزار ہا اشعار کے قصیدے پڑھتے تھے، ان کی مجلسی زندگی پر بھی یہی کیفیت طاری تھی اور مخالف قبیلوں کے خلاف اپنے قبیلے کے جوانوں کا خون گرم کرنے کیلئے یا تو اپنے اسلاف کے کارناموں کے قصیدے پڑھے جاتے یا پھر دشمن قبیلے کی ہجو کی جاتی یعنی ان کیخلاف ہرزہ سرائی عام بات تھی مگر ہادی برحقؐ کی بعثت کے بعد ان کی شانِ اقدس میں ایک نئی صنف شاعری طلوع ہوئی جو عقیدے کی زمین پر ایسے سجدہ ریز ہوئی کہ نعت گوئی میں ڈھل کر عبادت کا رخ اختیار کر گئی۔

آپ کی ذات ہے نورِ صبحِ ازل
اس جگہ روشنی ہے جہاں آپؐ ہیں

.....

جہاں تک نعت گوئی کی ادبی تاریخ کا تعلق ہے محمد کاظم صاحب، خالد احمد کی کتاب "تشبیب" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ:

اردو نعت کے پیچھے صدیوں پر پھیلی ہوئی ایک طویل روایت ہمیشہ موجود رہی ہے، جس کی ابتدا رسولؐ اللہ کے عہد میں ہوئی اور صحابی شعراء کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اس صنفِ سخن کے (جسے عربی میں المدح النبویؐ کہتے ہیں) بنیادی خدوخال متعین کیے۔ آگے چل کر یہ روایت عربی اور فارسی شاعری کے دو متوازی

دھاروں کی صورت میں آگے بڑھتی ہے اور اس کا یہ طویل سفر آج تک جاری ہے۔

مسلم شعرا کا قلب ہر دور میں نعت کی تجلی سے منور رہا۔ ہر ایک نے شاہِ اممؐ کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ ''خالد احمد'' بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جن کو دربار عطا سے مہر یافتہ قلم عطا ہوا جس کے وسیلہ بنا کر انھوں نے ''بابِ اظہارِ عشق'' پر سلیقے سے ''تشبیب'' رقم کر دیا۔ بلا مبالغہ ''تشبیب'' ان کا ایسا زادِ راہ ہے جس سے انھوں نے اپنے اگلے راستے کو آسان اور منزل کو یقینی کیا۔۔ ''تشبیب'' کے تعارف کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ حُبِ نبیؐ میں ڈوبے مُحِبّی کی صدا ہے، آقاؐ کے اوصاف پر مبنی پُرنور الفاظ کا خزانہ ہے۔ یہ آیات کا ترجمہ بھی اور تفسیر بھی۔

''نعت'' تنقید سے مبرا ہے (شعر کے وزن، بحر اور عروض پر بات کرنا اور ہے تخیل اور مضمون پر انگلی اٹھانا اور ہے)۔ میری کاوش میرے محترم کے تخیل کا ترجمہ ہے۔ یہ اس صدا کی بازگشت ہے جو ایک مُحِبّی کی روح کے دریچوں سے ابھری۔ یہ عکس ہے اس تصویرِ معرفت کا جو ان کی چشمِ عرفان نے بہت قریب سے دیکھی یا یوں کہیے یہ سبق ہے اک عارف استاد کا جسے ایک شاگرد دوہرا رہا ہے۔ آنے والے وقت کو سنا رہا ہے۔۔۔۔

وحیٔ عشق: ابتدا ہے اللہ کے اُس اِسم سے جو علوم کا شہر اور حکمت کا در بھی۔ درود و سلام اُس ذاتِ جامع انوار پر جس کے وجودِ پُرنور کے صدقے خالق نے میزبان ہو کر انسان کو نطق، نطق کو لہجہ، لہجے کو بیان اور بیان کو ابدی حیات کے لیے قلمدان عطا کیا۔ " تشبیب " میرے ہاتھوں میں ہے۔ ہاتھ لرزتے ہیں اور لرزتے لرزتے کوچہ رحمتِ دوجہاں میں اذنِ دخول کی خاطر دستک کو اٹھتے ہیں۔ سانسوں کی تسبیح پہ درود جاری ہے۔ خانہءِ دل سے لے کر دریچہء روح تک اس زیر و بم سے پیدا ہونے والا معطر سا شور بپا ہے۔ اک مہک کا پُرسوز ارتعاش ہے۔ جو تحت الشعور سے شعور کے ایوانوں تک مطالب و مفاہیم کے ہر حرف کو کیف و سرور بخش رہا ہے۔ وہ کیف جو جامِ ولا سے مخمور ہونے والوں کو نہ صرف لذتِ عشق سے آشنا کرتا ہے بلکہ معشوق کے در پہ سجدہ ریز ہو کر بے ساختہ روداد قلب بیان کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔ یہی وقت دیوانوں پہ بھاری ہوتا ہے۔

وہ عالمِ بے خودی میں دہلیزِ مہ خانہ تک پہنچتے
ہیں اور ساقی ءکوثر کی بارگاہ میں جھک جاتے
ہیں- زبان احسان کے بوجھ تلے دب کر
شاہِ کون و مکان کی بارگاہ میں مدح سرا ہو
جاتی ہے- شاید یہی وہ نوری لمحے ہوتے ہیں
جب حرف شرف قبولیت کی سند پا کر سرفراز
ہوتے ہیں- ہاں یقیناً یہی وہ پل ہوتے ہیں
جب مدحتِ رسولِ دو جہاں بیان ہوتی ہے
اور یقیناً یہی وہ ساعتِ معطر ہوتی ہے جب
"نعت" نازل ہوتی ہے-
نزول کے یہ لمحے کائناتی ماہ و سال سے کہیں
پرے، کسی نوری مدار میں گزر بسر کرتے
ہیں- کیونکہ یہ دو اور دو چار کے فارمولے
سے یکسر جدا ہیں- "یہاں" وحیء عشق
مودت کی زبان بنتی ہے- زبان پہ حرف
آیتوں کی مثل اترتے ہیں، حرفوں کے سنگم
سے لفظ بنتے ہیں تو لفظوں کے سلسلے دراز
ہوتے ہیں- یعنی لفظ در لفظ معانی کا اک
جہانِ لاتمام، صورت نکھارتا ہے- ایسا جہاں
کہ جس کے ہر کوچے ہر بازار میں کھلتے
معرفت کے اک اک باب سے مدحت و
عقیدت کے لاکھوں ابواب کھلتے ہیں-
سلسلہء فضائل کے لامتناہی ابواب-

"ترا جب ذکر آتا ہے"
میں تیرا نام لیتی ہوں
مرا دل جھوم جاتا ہے
مری بینائی و روح میں
کوئی خوشبو بکھرتی ہے
ترا اسمِ گرامی پھر
یہ پلکیں چوم لیتی ہیں
وحی جب عشق کی اترے
تو اندر نور کی لپٹیں
تمھارا ذکر بن کر
نعت کی صورت نکلتی ہیں
زباں پہ ذکر آتے ہی
مرا دل جھوم جاتا ہے
مری سانسیں مہکتی ہیں
مری آنکھیں چمکتی ہیں
یہ جیون مسکراتا ہے
ترا جب ذکر آتا ہے
مرا دل جھوم جاتا ہے---

تشبیب پر لکھتے ہوئے نعتیہ نظم-- سیدہ آیت گیلانی)
تشبیب بھی فضائل کی کتاب ہے اس ذات
کے فضائل زمان و مکاں مل کر بھی جس کے
فضائل کی ابتدا کو نہ پا سکیں--

[جاری ہے-]

’مکلی میں مرگ‘۔ایک باطنی تشکیل

محمد حمید شاہد نے اپنے حالیہ شایع ہونے والے مضمون ’’بیان اور بیانیہ‘‘ (روزنامہ جنگ، کراچی 15 فروری 2021) کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے بیانیہ کے باب میں ایک اصول متعین کیا ہے: ’’وہ بیان جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا ذکر ہو (اسے) event یعنی واقعہ کہا جائے گا‘‘۔ اور پھر درج ذیل مثالیں پیش کی ہیں جنہیں واقعہ کہا گیا ہے:

01- اس نے دروازہ کھول دیا۔
02- دروازہ کھلتے ہی کتا اندر آ گیا۔
03- کتا اس کو کاٹنے دوڑا۔
04- وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب ظاہر ہے ان جملوں سے بہ آسانی واقعہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ یہ سیدھے جملے ہیں، جن کے درمیان ایک واقعاتی ربط براہ راست موجود ہے۔ اس کے بعد محمد حمید شاہد لکھتے ہیں کہ فاروقی صاحب کی نظر میں جن بیانات سے واقعہ قائم نہیں ہوتا، وہ یہ ہیں:

01- کتے بھونکتے ہیں۔
02- انسان کتوں سے ڈرتا ہے۔
03- ہر کتے کے جبڑے مضبوط ہوتے ہیں۔
04- کتے کے نوکدار دانتوں کو دندانِ کلبی کہا جاتا ہے۔

محمد حمید شاہد مزید لکھتے ہیں کہ درج بالا چاروں بیانات کو فاروقی صاحب نے دلچسپ تسلیم کیا ہے مگر ان کے ساتھ واقعے کے قیام کو رد کیا ہے۔ فاروقی صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے محمد حمید شاہد اپنی بات یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک لمحے کے لیے تصور باندھیے کہ کتوں کے بارے میں یہ معلومات کہانی میں محض کتے کے حوالے سے نہیں آ رہی ہیں۔ کہانی ایک ایسے مسلح آدمی کی بیان کی جا رہی ہے جو آدمیت کے منصب کو جھٹک چکا ہے۔ اب آپ دیکھیں گے کہ اوپر کے سارے بیانات سے واقعہ قائم ہونے لگا ہے۔ آدمیت کے منصب کو جھٹکنے والا آدمی بول رہا ہے اور قاری ایک کتے کو بھونکتے ہوئے دیکھ رہا ہے (روزنامہ جنگ، کراچی 15 فروری 2021)۔

شاہدہ دلاور شاہ

شمس الرحمن فاروقی نے جن events کو واقعہ تسلیم کیا ہے، اردو ادب کا فکشن ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں ان کا اپنا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' نہیں آتا۔ اس لیے کہ وہاں ناول کے کئی حصے ایسے ہیں جو ایک سطح پر اس طرح نہیں جڑتے جیسے وہ یہاں بیان کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شایع ہونے والے اردو کے دو ناول، ایک اعجاز روشن کا ''حسرت تعمیر'' اور دوسرا علی اکبر ناطق کا ''کماری والا'' بیان کی اسی ذیل میں آتے ہیں جسے فاروقی صاحب واقعہ مانتے ہیں اور جو سیدھا کہانی کو بیان کرتا ہے۔ اس کے تقابل میں حال ہی میں شایع ہونے والا ڈاکٹر غافر شہزاد کا ناول ''مکلی میں مرگ'' کا بیانیہ وہ ہے جسے محمد حمید شاہد نے سپورٹ کیا ہے۔ یعنی اگر ان چاروں بیانات کو باہم باندھنے والا کوئی ایک کردار ہوگا، تو وہ آسانی سے شمس الرحمن فاروقی صاحب کے مطابق واقعہ بن جائے گا لیکن اگر ان چاروں جملوں کو باندھنے والا عمومی کردار ہونے کے بجائے اپنے اندر کسی نظریے کی گہرائی لیے ہوگا تو قاری اپنے تخیل سے ان چاروں بیانات میں ایک ربط پیدا کر کے خود بھی اس کہانی کا حصہ بن جائے گا۔ ہمارا جدید یا مابعد جدید ادب قاری سے ایسی ہی توقعات رکھتا ہے۔ اب آیئے ''مکلی میں مرگ'' کو اس تناظر میں دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر غافر شہزاد صاحب نے اپنے ناول میں چار ایسے کردار متعارف کروائے ہیں (یہ چار سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، یہاں اتفاق سے چار ہیں)، جن کی معیت میں ان کا ناول جدید اور مابعد جدید بیانیے کا حامل قرار پاتا ہے۔

پہلا کردار ارسلان کا ہے، جو آرکیٹیکٹ ہے، اس نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی، مگر صوفیا کے کلام سے اس کی انسیت ہے۔ وہ اس روحانی سفر میں ناول کا مرکزی کردار قرار دیا جا سکتا ہے جس کی مکلی میں ہونے والی کانفرنس کے دوران کایا کلپ ہوتی ہے اور وہ پھر ایک تبدیلی لانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔

صائمہ علی دوسرا کردار ہے جو مزارات کے ساتھ اپنی دادی کے ہمراہ بچپن سے ہی وابستہ رہا ہے، اور دادی کے انتقال کے بعد بھی اس کا سفر جاری رہتا ہے اور وہ بی بی پاکؒ کے مزار کی توسیع کے لیے حکومتی ایوانوں، بیوروکریسی اور عدالتوں تک جاتا ہے اور اپنے توانا ہونے کی وجہ سے تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے۔

تیسرا کردار طارق اسمٰعیل کا ہے جو آرکیٹیکٹ اور صحافی ہے، تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے، مزارات اس کی بیٹ میں آتے ہیں، اس لیے وہ ان کے بارے میں فیچر لکھتا ہے۔ طارق اسمٰعیل کا یہ مضبوط کردار ارسلان کے ساتھ گفتگو میں روحانی تبدیلی کے اس سفر میں اس کی معاونت کرتا ہے۔

چوتھا اور آخری اہم کردار بابا مستان کا

ہے۔بابا مستان ایک عملی صوفی ہے جو اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر نکلا ہوا ہے۔وہ مختلف مزارات پر باقاعدگی سے جاتا ہے، اسے درویش سمجھتے ہوئے مزار کی انتظامیہ نے اس کے بیٹھنے اور رات بسر کرنے کے لیے ہر مزار پر کوئی حجرہ مقرر کر رکھا ہے۔وہ کسی سے بات نہیں کرتا، ورد کرتا رہتا ہے اور آنے والے اس کے پاس آ کر کچھ دیر بیٹھتے ہیں اور پھر بغیر کوئی بات کیے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

بظاہر یوں لگتا ہے کہ یہ ناول ان چار کرداروں کے بارے میں کہانیاں پیش کرتا ہے، مگر حقیقت میں بات یہاں تک ختم نہیں ہوتا۔ان چاروں کرداروں کو ایک بیانیے میں باندھا گیا ہے۔وہ بیانیہ چاروں کرداروں میں مشترک ہے۔سب کی اپنی اپنی تلاش ہے مگر مرکز ایک ہی ہے۔وہ مرکز زندگی اور موت کا باہمی تعلق ہے۔زندگی اور موت ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے، جب موت آتی ہے، زندگی ختم ہو جاتی ہے۔مگر ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ اس نے مزار کو اپنے ناول کا اسٹیج بنایا ہے اور وہ اپنے ناول میں لکھتا ہے کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں موت اور حیات دونوں ایک ہی وقت میں موجود رہتے ہیں اور کئی صدیوں سے اکٹھے موجود ہیں۔اچ شریف کے مزارات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے:

''ارسلان اس بات پر حیران تھا کہ اُچ شریف کو ایک ہی وقت میں مردہ اور زندہ انسانوں کی بستی قرار دیا جا سکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ معلوم ہی نہیں پڑتا، کہاں گھر ختم ہوتا ہے اور مزار کی حدود کہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ گویا یہ قصبہ قبل از موت اور بعد از موت انسانوں نے بہ یک وقت بسا رکھا ہے'' (ص 74)۔

صائمہ علی کا ناول میں بہت زور دار کردار ہے جو حکومت، بیوروکریسی اور نظریات سے ٹکرا جانے کی طاقت رکھتا ہے۔اسے بچپن سے بی بی پاکؒ سے عقیدت ہے، جو اتفاق سے اپنی دادی کے ساتھ وہاں حاضری دیتے ہوئے پیدا ہوتی ہے۔بی بی پاکؒ کا مزار اس کے لیے ایسے ہی اہم ہے جیسے بچپن میں دادی، اور اب نئی تعمیر کے لیے وہ اس مزار کی تعمیرات کی شناخت تبدیل کرنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیتی ہے، مگر یہ تبدیلی لانے کے لیے اسے انتظامی اور عدالتی مزاحمت کا اس لیے مقابلہ ہے کہ ان اداروں کو ڈر ہے کہ کہیں عوام اس تبدیلی پر سڑکوں پر نہ آ جائیں۔اس لیے وہ صائمہ علی کی تمام کوششیں ناکام کر دیتے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی لانے کے لیے اسے ایسے آرکیٹیکٹ کی ضرورت ہے جو روحانیت کے اس سفر میں کچھ منزلیں طے کر چکا ہو اور یہ کام ارسلان بہتر انداز سے کر سکتا ہے۔

طارق اسمٰعیل تبدیلی لانے کے لیے اخبارات میں فیچر لکھتا ہے، مزاروں اور درباروں پر ہونے والی کرپشن کو بے نقاب

کرتا ہے اور وہاں کی روحانی فضا میں چھپے ہوئے وائٹ کالر کرائم کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتا ہے، اسی مقصد کے لیے وہ بابا مستان کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی اسٹوری کی تلاش میں اس سے ملتا رہتا ہے۔

چوتھا کردار بابا مستان روحانیت کے ایسے سفر کی نمائندگی کرتا ہے کہ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے، نہ اس کی انتہا ہے۔ روحانیت کا یہ سفر کہیں درمیان سے شروع ہوتا ہے اور درمیان میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دائرے کا سفر ہے کہ جس کی ابتدا اور انتہا کا پتہ نہیں چلتا۔ لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں مگر بابا مستان ایسا ہی ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک دائمی مسکراہٹ موجود رہتی ہے۔

یہ چاروں کردار اور ان سے وابستہ واقعات اپنے اندر ایک تبدیلی اور تحرک کی قوت رکھتے ہیں۔ محمد حمید شاہد اپنے مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یوں چار واقعات باہم مل کر ایک ایسی کہانی بناتے ہیں جو احساس کی سطح پر تو حرکی ہے مگر خارج میں فقط بیان ہے۔ یہ بیانیہ ہی ہوتا ہے جو متن کی باطنی ترکیب اور ترتیب کو حرکی بناتا ہے'' (روزنامہ جنگ، کراچی 15 فروری 2021)۔

''دمکلی میں مرگ'' میں صرف یہ چار کردار ہی نہیں ہیں۔ انہیں موثر طور پر مزارات اور اس سے جڑی زندگی کے پھیلاؤ اور اتار چڑھاؤ کو بیان کرنے کے لیے کئی دوسرے کردار اور واقعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں جس سے معانی کی سطح پر متن کثیر جہتی ہو جاتا ہے۔ ناول میں ان کرداروں کے تشکیل پانے کی وجوہات کا پس منظر بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ارسلان کی ماں کا تعلق خواجہ غلام فریدؒ کے گاؤں کوٹ مٹھن سے ہے۔ اس کی شادی انگریزی ادب کے ایک پروفیسر سے ہو جاتی ہے جسے مجسمے بنانے کا شوق ہے۔ یوں ارسلان کی شخصیت روحانیت اور جدیدیت کے درمیان پروان چڑھتی ہے اور بظاہر جدید عمارتیں ڈیزائن کرنے والا آرکیٹیکٹ ہے مگر آخر اس کی کایا کلپ ہوتی ہے اور وہ روحانیت کے مراکز ڈیزائن کرنے میں اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیتا ہے۔ صائمہ علی کا کردار بچپن سے اپنی دادی کے زیر سایہ تشکیل پاتا ہے جو اسے ساتھ لیے مزاروں پر ہر جمعرات کو حاضری دیتی رہتی ہے اور صائمہ علی کے اندر ایک تبدیلی آتی ہے۔ صائمہ علی اس وجہ سے ہی مزارات کے انتظامات کی ذمہ دار انتظامی مشینری اور عدالتی نظام سے ٹکراتی ہے۔ وہ عدالت میں انصاف حاصل کرنے کے لیے جاتی ہے مگر بیوروکریسی اور عدالتی نظام اسے بے بس کر دیتا ہے۔ طارق اسمٰعیل کا کردار ایک صحافی کا کردار ہے جس کے خون میں حقیقی سچائی کو سامنے لانے کا جوش ہے۔ یہ جوش اسے وراثت

میں ملا ہے ورنہ وہ بھی محض عمارات ڈیزائن کر کے ارب پتی بن سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک پیشہ ور صحافی کی طرح اسٹوری کی تلاش میں وہ اپنی ساری توانائیاں صرف کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ بابا مستان کا کردار بھی اپنے سیاق وسباق کے ساتھ ناول میں موجود ہے۔ اس کا آخری واقعہ شاہ جمال کے مزار پر ڈھول پر دھمال ڈالنے والے event پر ختم ہوتا ہے جس میں شرکت کے لیے امریکہ سے ارسلان کے کلاس فیلو: کیتھی اور بوش، خصوصی طور پر لاہور آتے ہیں۔

اس بیانیے کی پیش کش کے لیے ایک ایسے سیٹ کی ضرورت تھی جہاں زندگی اور موت اور اس سے جڑے روحانی عناصر اور کردار پوری طرح اپنا کردار ادا کر سکیں۔ ان روحانی مراکز کو تشکیل دینے والے معمار ہی ہوتے ہیں جو آج کل آرکیٹیکٹس کہلاتے ہیں جو مزارات کی عمارتیں بناتے ہیں اور مزار کی ضرورت کے مطابق وہاں کا ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ اس کے لیے جہاں بہت سارے مزارات کا ذکر ناول میں کیا گیا ہے وہاں ایک کانفرنس کے انعقاد کے لیے 400 سال قدیم قبرستان مکلی (سندھ) کا انتخاب کیا گیا جہاں ایک اور ناول کے کردار کو زندہ کر کے اس کی موت کی المناک کہانی بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر غافر شہزاد کو آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ایک اہم سوال ہے مگر اس کا جواب بھی اس کے ناول میں ملتا ہے جب وہ لکھتا ہے:

''دنیا سے چلے جانے کے بعد مرحومین، زندہ انسانوں کے ذہنوں میں ایک اور طرح کی زندگی پا لیتے ہیں۔ یہ زندگی زندہ انسانوں کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ مرنے والے کو جس نے جس انداز سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ذہن میں ویسے ہی زندہ رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کو دوسروں تک پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ کیا عمل ہے؟ اسے ہم انسانوں کی زندگی سے موت تک کے سفر میں کہاں رکھتے ہیں؟'' (ص 06)۔

ڈاکٹر غافر شہزاد نے اپنے بیانیے میں موت اور زندگی کے کئی روپ پیش کیے ہیں۔ ایک زندگی اور موت کا عام کھیل ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ ایک زندگی وہ ہے جو انسان ہمارے ذہنوں میں پاتے ہیں۔ ایک زندگی وہ ہے جو لکھی گئی کتابوں میں پیش کیے گئے کردار پاتے ہیں۔ ایک زندگی صوفیا کی ہے، دفن ہونے کے بعد بھی ان کی قبر انہیں زندہ رکھتی ہے۔ ''مکلی میں مرگ'' میں کرداروں اور واقعات کے بیانیے کے اشتراک کی بدولت ایک ایسی مجموعی فضا تشکیل پاتی ہے جو ایک بڑی سطح پر منظر نامہ کو پیش کرتی ہے۔ یہ ایک بڑا ناول ہے جس کی باطنی تشکیل کو دریافت کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔

☆☆☆☆☆

آبروئے ادب.....جناب اقبال راہی

شاعری لطیف جذبات کے اِظہار کا نام ہے زندگی کی شاہراہ کے اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے اِنسان دُکھ سہتا اور سُکھ اُٹھاتا آگے بڑھتا رہتا ہے عام طور پر یہ عمل صرف جادہ پیمائی تک محدود رہتا ہے اگر کوئی اِنسان راستے کے پیچ وخم، دشواریوں اور سختیوں کو محسوس کرتا ہے، دشواریوں کا حل سوچتا ہے اُفتاد کے اصول وضع کرتا ہے یہ کام مفکروں، دانشوروں اور اہلِ فِکر ونظر کا ہے اِسی قافلے کا ایک اہم کردار شاعر بھی ہے شاعری ایک حساس موضوع ہے جسے اِس بے حِس اور مادیت پرست دور میں دردِ دِل اور ذوق رکھنے والے لوگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں آسمانِ ادب پر ستاروں کی خوبصورت کہکشاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک دمک رہی ہے اِن چمکتے تاروں میں کبھی کوئی تارا جلنے بجھنے لگتا ہے تو کبھی کوئی تارا دھیرے دھیرے اپنی روشنی کھو دیتا ہے اور دور کہیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ایسے میں ہماری سانسیں رکنے لگتی ہیں اُردو ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے اس تاریخ کے دامن میں بیش قیمت موتی پنہاں ہیں جِس میں ایک نام استاد الشعرا جناب حضرتِ احسان دانش کا ہے۔

احسان دانش صاحب کی شخصیت ادب میں اپنے تئیں ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ حضرتِ احسان دانش کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا جس طرح ہونا چاہیے تھا ہماری

علی حسین عابدی

ادبی تنظیمیں اور حکومتی ادارے اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کر سکے جو کہ انتہائی افسوس کی بات ہے ہماری آنے والی نسلیں جو پہلے ہی جدید ٹیکنالوجی کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہیں اُنہیں کیا خبر کہ کتنے عظیم لوگ اِس دھرتی کے سینے پر علم وشعور وآگہی کے چراغ روشن کرتے رہے ہیں۔

حضرت احسان دانش کی جھلک اُن کے شاگرد و دلاور استاد فی البدیہہ شاعرِ بے مثل جناب اقبال راہی صاحب میں بھرپور انداز میں نظر آتی ہے راہی صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں جن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے طفلِ مکتب کے بس کی بات نہیں راہی صاحب کی زندگی جدوجہد دُکھوں اور غم سے عبارت ہے ہر لمحہ ہر آن لبوں پر مسکراہٹ سجائے خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ملنا راہی صاحب کا خاصہ ہے کہ سامنے والا نہ صرف اُن کا مداح بن جاتا ہے بلکہ راہی صاحب کے ساتھ دلی لگاؤ کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے زندگی کے نشیب وفراز اُونچ نیچ اُتار چڑھاؤ اقبال راہی کے حوصلوں کو کبھی پست نہیں کر سکے بلکہ اُنہیں ہمیشہ شکست کا سامنا کرپڑا اولاد کا غم بڑا غم ہے صحیح معنوں میں کہا جائے تو یہ غم کہیں کا نہیں چھوڑتا اولاد کا غم سینے میں لئے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرنے والے راہی صاحب کے بارے سامنے والے کو کیا خبر کہ اس سینے میں کتنے الاؤ جل رہے ہیں جو نہ کبھی بجھ سکتے ہیں نہ کبھی ان کی حدت میں کمی آسکتی ہے جواں سال بڑے بیٹے فیصل اقبال کی بے وقت موت نے گویا اقبال راہی کی زندگی میں مستقل غم کی نوید سنا دی تھی اُس کے بعد جواں سالہ بیٹی نیلم اقبال تھلیسیمیا کے مرض میں مبتلا باپ کے چہرے پر بڑھاپے کو عیاں کرگئی یہ غم ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ جوانی کے شباب میں قدم رکھنے والا صاحب دیوان بیٹا فرحان اقبال تھلیسیمیا جیسی موذی مرض کے ہاتھوں داغ مفارقت دے گیا اور اب اُن کا جواں سال بیٹا عالمِ شباب میں کامران اقبال تھلیسیمیا جیسی جان لیوا مرض کے ہاتھوں ہر روز لڑتے ہوئے زندگی کو آگے دھکیل رہا ہے یقین مانیئے دل خون کے آنسو روتا ہے پروردگار اقبال راہی صاحب پر اپنا فضل بنائے رکھے اور کامران اقبال کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

راہی صاحب نے ہمیشہ محبتوں کے گلاب کھلائے ہیں خلوص عاجزی اور صلہ رحمی جیسے اوصاف کی آبیاری کی ہے نبیر کم کے

چکر سے خود کو دور رکھا کبھی دل میں شہرت جیسی بے وقت چیز کو جگہ نہیں دی یہ بات بظاہر بہت تلخ ہے لیکن سچ یہی ہے کہ ہمیں بڑے شاعر تو جا بجا نظر آتے ہیں لیکن بڑے انسان کا ملنا خال خال ہے اقبال راہی صاحب بلاشبہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے انسان ہیں راہی صاحب نے ہمیشہ ادبی پروگراموں مشاعروں میں میزبان کی حیثیت سے شرکت کی صدارت جیسے اعزاز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے رخی کا اظہار کیا کوشش کی کہ کوئی نوجوان دوست اس منصب پر اپنے فرائض انجام دے اس میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبات میں اپنے فی البدیہہ جملوں اور اشعار سے محفل میں چار چاند لگا دینا اُن کا خاصہ ہے اتنی محبت سے بات کرتے ہیں کہ لکھنے والے کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور شخصیت میں کوئی فرق بھی نہیں پڑتا راہی صاحب کا ذہن نوک زباں پر رکھا رہتا ہے حاضر جوابی ایسی کہ۔ واہ بھئی واہ۔ نگاہ عقابی مگر آنکھ کی پتلی کے اندر اضطراب کا ایک سمندر بند ہے محفل میں موجود کوئی شخص اِن کی نگاہ کے زاویے سے بچ کر نہیں جا سکتا جیسا آدمی ویسا جملہ پتہ نہیں لگتا کہ شخصیت پہلے سامنے آئی یا اُنہوں نے جُملہ پہلے ساخت کیا یا کہ وہ فقرہ گر ہیں بلکہ فقروں کے بادشاہ ہیں مزاح اِس طرح کا کہ ہنسی رکتے نہیں رکتی ایک ہاتھ منہ پر اور دوسرا پسلیوں پر رکھنا پڑتا ہے اس سال اقبال راہی صاحب کو ادب کی خدمت کرتے ہوئے پچاس سال مکمل ہو گئے ہیں یہ پچاس سال ادب کی خدمت کرتے گزر گئے راہی صاحب نے پہلا مشاعرہ غالباً 1975 میں پڑھا جس کا اہتمام اُس وقت کے وزیرِ خوراک ملک خدا بخش بچہ نے کیا اور مشاعرے کی صدارت استاد قمر اجنالوی نے کی اور مہمانِ خصوصی حضرت احسان دانش تھے پہلا شعری مجموعہ کلام۔ زندہ حروف۔۔1988 میں شائع ہوا جسے گولڈ میڈل سے نوازا گیا اُس کے بعد۔ پھول پھول خوشبو۔ انتخاب شائع ہوا قطعات پر مشتمل مجموعہ کلام۔ ہائی الٹ پاکستان۔۔ پھر ۔۔۔ قطعہ برید۔۔ }قطعات{ جس کا نام (مرحوم) اعزاز احمد آذر نے تجویز کیا شعری مجموعہ۔ شکل۔۔۔ شائع ہوا اور اب روزنامہ اوصاف لاہور کے ادارتی صفحے پر روزانہ کی بنیاد پر شائع ہونے والے قطعات پر مشتمل خوبصورت ادبی گلدستہ۔ پاکستان کا روزنامچہ۔ کے نام سے معروف شاعرہ زرقا نسیم غالب نے

اعزازی طور پر اپنے ادارے زرقا پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع کیا ہے بچوں کے حوالے سے اقبال راہی صاحب نے بہت عمدہ ادب تخلیق کیا ہے چند اماموں۔ کھلونا۔ بچوں کا باغ۔ جیسے نامور ادبی جرائد میں مسلسل لکھتے رہے مزاح کے حوالے سے شائع ہونے والے رسالے۔ قہقہہ میں مزاح نگاری کے حوالے سے ادبی خدمات انجام دیں ہفت روزہ نیا پیام میں قلمی خدمات انجام دیتے رہے روزنامہ مغربی پاکستان جس کے چیف ایڈیٹر قمر اجنالوی تھے اس میں ادبی ایڈیشن اور اداریہ لکھنے کی ذمہ داری بخوبی نبھائی ہفت روزہ استقلال۔ لیل ونہار۔ اور امروز میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے روزنامہ افلاک سے قطعہ نگاری کا آغاز کیا اس کے بعد کوہستان میں قطعہ نگاری شورش کاشمیری کے پرچہ چٹان میں باقاعدہ ملازمت اختیار کی اور اپنی صلاحیتوں کو ادارے کے لیے وقف کر دیا روزنامہ۔ تحفہ۔ گوجرانوالہ

فلم لائٹ۔ ڈائریکٹر۔ فلمی۔ شمع رسالہ لاہور اور کراچی میں باقاعدہ لکھتے رہے راہی صاحب اب گزشتہ آٹھ (8) سال سے روزنامہ اوصاف لاہور کے ادارتی صفحے پر قطعہ نگاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس کے علاوہ ماہنامہ تارکینِ وطن انٹرنیشنل لاہور میں بطور ایڈیٹر کام کر رہے ہیں اگر دیکھا جائے تو راہی صاحب کی پچاس سالہ زندگی قلم وقرطاس کے گرد گھومتی نظر آتی ہے یوں تو راہی صاحب کو بیسیوں ایوارڈز ملے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ راہی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس جیسے معتبر اعزاز سے نوازا جانا چاہیے گو کہ راہی صاحب کے فن پر ایک ایم فل منہاج یونیورسٹی لاہور سے ہمایوں شاہد نے مکمل کیا ہے راہی صاحب کی سوانح عمری کے حوالے سے شائع ہونے والی کتاب کی ذمہ داری (ایڈیشنل آئی جی) پنجاب جناب غلام رسول زاہد صاحب نے لی ہے مجھے یقین ہے یہ کتاب ادب کے گلشن میں نمایاں پھول کی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہو گی -- قطعات کا نیا مجموعہ کلام — پاکستان کا روزنامچہ — پڑھنے کے لائق ہے راہی صاحب کی ملکی سیاست اور معاشرتی ناانصافیوں اور سیاست کے داؤ پیچ کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر ہے کتاب کے مطالعے سے قاری کی سوچ کے دھارے حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں ویسے تو یہ کام خود راہی صاحب اپنی

سوانح عمری لکھتے وقت انجام دیں گے لیکن احباب کی دلچسپی کے باعث اقبال راہی صاحب سے عقیدت و محبت رکھنے والے افراد کے نام لینا چاہوں گا۔

احسان دانش - ساغر صدیقی - شورش کاشمیری- مناظر حسن نظر- شریف شیوا- آغاز برنی- کلیم عثمانی- نذیر نقش- اقبال کیفی - شفیق کوئی - کنول فیروز - قتیل شفائی- احمد ندیم قاسمی- عطاالحق قاسمی- جوش ملیح آبادی- نوابزادہ نصراللہ- حفیظ تائب- اشفاق احمد - منیر سیفی - خالد احمد - نجیب احمد- امجد اسلام امجد- دلدار پرویز بھٹی- مہدی حسن - عطااللہ عیسیٰ خیلوی - انجم رومانی - جسٹس نسیم حسن شاہ - شہرت بخاری- منیر نیازی- احمد فراز - پروین شاکر- نوشی گیلانی- حمیدہ شاہین- بشریٰ انصاری- ڈاکٹر خورشید رضوی- ڈاکٹر خواجہ زکریا- ڈاکٹر اجمل نیازی- باقی احمد پوری- ڈاکٹر جمیل جالبی - اعزاز احمد آذر - احمد راہی- ایس ایم ظفر- ڈاکٹر طارق عزیز- انور سدید- مشکور حسین یاد- غلام رسول زاہد- راجہ رشید محمود- ڈاکٹر نثار ترابی- ابصار عبدالعلی- نقش ہاشمی- عنایت حسین بھٹی- قاضی جاوید- میاں منظور شاہد- کیپٹن عطا محمد- صفدر اصدف- صوفیہ بیدار- شوکت علی- راشد محمود- عاصم بخاری- تاثیر نقوی- نعمان منظور- اعجاز رضوی- فرحت عباس شاہ- عارفہ صبح خان- سلیم اختر - خالد شریف- خالد جاوید جان- اعتبار ساجد - کرامت بخاری- فیصل زمان چشتی- زرقا نسیم غالب- عروج زیب- پروین کمل- آصف جاوید کمانڈو- فراست بخاری- لبنیٰ صفدر- حسن عباسی- منزہ سحر- ماہا نسیم- اقبال پیام- عقیل شانی- ڈاکٹر ایم ابرار- عامر بن علی- مرتضیٰ برلاس- محمد ظہوری- جیسے سینکڑوں احباب سے ملاقات ملنا ملانا اور عقیدت کا رشتہ ہے اقبال راہی صاحب لفظوں کے دیپ جلانے کے لیے روشنی مستعار نہیں لیتے بلکہ روشنی خود ان کے اندر سے پھوٹتی ہے اور تاریک ذہن و دل کو منور کرتی چلی جاتی ہے راہی صاحب ادب میں ایک بزرگ کی حیثیت کے ساتھ سائبان کی طرح ہیں بلاشبہ اقبال راہی صاحب-- آبروئے ادب ہیں پروردگار ان کا سایہ ہم پر بنائے رکھے اور ہمیں علم کے موتی اپنے دامن میں بھرنے کی توفیق عطا فرمائے ---

پاکستان کا روزنامچہ - کی اشاعت پر راہی صاحب کو مبارکباد اور صحت و سلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔

☆☆☆☆☆

طنز و مزاح

اور پھر یوں ہوا کہ پنکھے چل پڑے --------

پنکھا زمانہ قدیم سے چلتا آ رہا ہے--- کبھی کبھی خراب بھی ہو جاتا ہے---- پھر ٹھیک بھی ہو جاتا ہے--- پنکھے کے عام طور پر تین نام ہیں--- پنکھا، پکھا اور فین- اس کے علاوہ کوئی اور لفظ سائنس ایجاد نہیں کر سکی- تیسرا لفظ فین اگر کوئی شخص بولے تو اس کو وضاحت کرنی پڑتی ہے کہ کونسا والا فین؟

پنکھے کی کچھ کوالٹیز حیرت انگیز طور پر عجیب و غریب ہیں-----ایک تو یہ کہ جب یہ آہستہ چل رہا ہو---تو اس میں سے جو لفظ آپ سوچیں گے وہی آواز آئے گی----- آزمائش شرط ہے---دوسری حیرت انگیز کوالٹی یہ ہے کہ یہ بندوں سے مشابہت بھی رکھتا ہے----وہ اس طرح کہ جب تیز چل رہا ہو تو نوجوان منڈا لگتا ہے----------اور جب آہستہ چل رہا ہو تو اس پر بڈھے بابے کی طرح کھانگڑ پیڈو کا گمان ہوتا ہے---اس کے علاوہ شوخی مارنے والے پنکھے بھی آپ کو ہر دوسرے گھر میں ملیں گے - - - - یہ پنکھے فرشی پنکھے کہلاتے ہیں--- کسی شوخ چنچل حسینہ کی طرح شان بے نیازی سے منہ دوسری جانب پھیر لیتے ہیں-----

پنکھے کی جدید ترین شکل اے- سی ہے--- یہ پنکھے کی سوتن بھی ہے---ان کی اکثر لڑائی رہتی ہے اس لیے اب جو لیٹیسٹ گھر ہیں وہاں پنکھے لگوائے ہی نہیں جاتے--- محض اے- سی پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے--- تاہم پنکھے کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ------یہ نہ بھی چل رہا ہو تو دل کو سکون رہتا ہے--- پنکھے کی خدمات کے اعتراف میں کسی قسم کے ایوارڈ کا اعلان تو نہیں کیا گیا--- جس پر یہ شکوہ نہیں کرتا، چلتا ہی رہتا ہے--------

پنکھے کو انگریزی میں فین کہتے ہیں--- لیکن فین کے لیے اردو میں دو الفاظ زبان زد عام ہیں ایک تو پنکھا اور دوسرا مداح-----یہ مداح بھی پنکھے کی طرح ہی کام کرتا ہے کیونکہ یہ مشہور شخصیات کے ارد گرد گھومتا ہی رہتا ہے---ہاں یاد آیا پنکھے کی ایک قسم لاہوری کولر بھی ہے یہ اے- سی اور پنکھے کی درمیانی شکل ہے----جس کو غریبوں کا اے- سی بھی کہتے ہیں--فرق یہ ہے کہ پنکھے سے ہوا، کولر

سیدہ آمنہ ریاض

سے ٹھنڈی ہوا اور اے۔ سی سے یخ ٹھنڈی ہوا آتی ہے------ نچلا طبقہ پنکھے پر ہی اکتفا کرتا ہے کیونکہ اس سے سستی تو صرف خاموشی ہی ہو سکتی ہے------ ہاں ایک پنکھا وہ بھی ہوتا ہے جس پر تاریخی گانا چلاں گی پکھیاں---تے بڑا کیچ کیمن گیاں اکھیاں بنایا گیا۔ اس پنکھے کی اتنی ویلیو ہے کہ کوئی شادی بھی اس گانے کے بغیر نہیں ہوتی۔۔ پنکھے کی یہ قسم پہلے ہر گھر میں پائی جاتی تھی---- البتہ اب پتہ نہیں کہاں پائی جاتی ہے؟؟؟

عام طور پر لوگ فروری کے آخر میں پنکھے چلا لیتے ہیں---- کچھ من چلے نوجوان تو اس سے بھی پہلے پنکھے چلاتے ہیں، ان کو گرمی نہیں لگ رہی ہوتی۔۔ وہ تو پنکھے کی تیز ہوا سے مچھر ہی بھگانا چاہتے ہیں---- جس پر گھر میں موجود افراد سوالیہ نظروں سے نہ صرف پنکھے کو دیکھتے ہیں بلکہ وہ سوال کرتے نظر بھی آتے ہیں---- خاص طور پر ابا جی کچھ ان الفاظ میں ان من چلوں کو ٹھنڈ پروگرام کرواتے

دکھائی دیتے ہیں کہ

ایہہ کتے پکھا چلایا اے؟؟؟ بل تیری ماں نے دینڑا اے؟؟ ایتی کیہڑی تینوں گرمی چڑھی اے---

ان تاریخی الفاظ کے ساتھ ہی پنکھا بند کر دیا جاتا ہے---- لیکن یہ من چلے باز نہیں آتے بلکہ جیسے ہی ابا جی سونے جاتے ہیں، یہ پھر پنکھا چلا لیتے ہیں اور یہ کھیل مارچ کے آخر تک جاری و ساری رہتا ہے---- اس دوران پنکھا کبھی آہستہ، کبھی درمیانی، کبھی تیز اور کبھی فل اڑان اڑتا ہے------ الغرض گھر کا ہر فرد آنے یا جانے والے موسم کے عین مطابق پنکھے پر تبصرہ کرنا اپنا فرض اولین سمجھے گا، چاہے اس نے بل دینا ہو یا نہ دینا ہو---------- البتہ ابا جی کے تبصرے میں خاصی جان اور گرمی ہوتی ہے---

جلسے جلوسوں میں سخت سے سخت گرمی میں یہی پنکھے کام آتے ہیں------ کیونکہ اے۔ سی ان ڈور تو کام دیتے ہیں لیکن آوٹ ڈور پنکھے کا ہی دور چلتا ہے------- البتہ کبھی کبھی پنکھے کے گرنے کی خبریں بھی سننے کو ملتی ہیں------ تاہم اس سلسلے میں جانی و مالی نقصان کی خبر نہیں ملی---

گرمیاں شروع ہوں تو سب سے پہلا کام پنکھا چلانے کا ہی ہوتا ہے--- کیونکہ اس میں کوئی محنت نہیں لگتی---- علاوہ ازیں چھوٹے بچے سب سے پہلے جن چیزوں کا ادراک حاصل کرتے ہیں وہ پ سے پنکھے کا ہی ہوتا ہے--- کیونکہ ان کو پنکھا آسانی سے نظر آ جاتا ہے---- دوسرا اوپر پنکھا چلتا ہے---- نیچے منا سوتا ہے

اس نظم کو قومی حیثیت بھی حاصل ہے--- شاید پنکھا واحد ایسی ایجاد ہے جس سے ہر خاص و عام خوش ہے---- ہاں بل دینے سے دو دن پہلے اور بل دینے کے دو دن بعد ماحول ذرا ٹیٹ ہوتا ہے--- اس کے علاوہ ستے خیراں---- آخر میں رب سے یہی دعا ہے کہ یہ پنکھے ہمیشہ چلتے رہیں---اور قوم کو کبھی بھی تتی وا نہ لگے----

☆☆☆☆☆

اب کہاں کی معتبر ہے شاعری.... [طنز و مزاح]

میں ذاتی طور شاعری کا عاشق اور دلدادہ ہوں - بدذوق ہوں اور نہ ہی شاعری کا ناقد - اسی مناسبت سے کسی شاعر کی دل آزاری کا بارِ عظیم اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا - میر و غالب اور فیض و فراز کی کتابیں شوق سے دیکھتا ہوں - آج بھی خواجہ آتش کا یہ شعر سر دھنتے ہوئے سنتا اور پڑھتا ہوں کہ

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

.....

حالانکہ اس شعر پر دانشور خان کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں شاعری سے زیادہ مصوری کی تعریف کی گئی ہے- گلی گلی برپا طوفان بدتمیزی نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جو آپ ابھی پڑھ رہے ہیں- آجکل جس نے بھی دو بول سیکھے اور دو لفظ لکھنے کے قابل ہوا، شاعر بن بیٹھا- مولانا حالی نے شاعر بننے کے لئے دیوانگی یا عاشقی کی جن دو منزلوں سے لازمی گزرنے کی شرط بیان کی تھی؛ ان ہی خاردار منزلوں سے ہر ایک خود کو پار نکلا ہوا تصور کرتا ہے- دیوانہ تو خیر کوئی کہلانے کے حق میں نہیں مگر عاشقی کا امتحان تقریباً" سبھی پاس کر چکے ہیں ، ایک عدد محبوبہ (فرضی) کے بلاشرکت غیرے محبوب بن چکے ہیں اور یوں اب الفاظ کو جوڑ کر قافیے ملانا ان صاحبان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا ہے- صرف یہی نہیں بلکہ محبوب کے زانو پہ آخری ہچکی لے کے شاعرانہ موت کے متمنی بھی دکھائی دیتے ہیں-

دوسری طرف تعجب اس وقت انتہاؤں کو چھونے لگا جب ستر سال سے مسلسل سننے اور نصابی کتابوں میں بار بار پڑھنے والا یہ دعویٰ! حرف غلط کی طرح جھوٹا اور بے معنی ثابت ہوا کہ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے اور ہم غذائی پیداوار میں خود کفیل ہیں- جب سے میں نے وطن عزیز میں گندم ، خوردنی تیل، آلو، ٹماٹر بلکہ یہاں تک کہ گوشت کو بھی باہر ملکوں سے منگواتے اور درآمد

نور کمال شاہ

ہوتے دیکھا ہے اسی وقت سے ماہرین کی مہارت اور خود کفالت کے اعداد و شمار پر سے اعتبار اٹھ سا گیا ہے۔ دانشور خان سے جب اس بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے، "دیکھو! یہ سب کتابی باتیں ہیں ورنہ اصل میں ہم کسی بھی جنس میں خود کفیل نہیں ہیں۔ آزادی ملنے کے ساتھ ہی دیگر کئی اثاثوں کی طرح ہم سرسید کا اپنی مدد آپ والا فارمولا بھی ہندوستان میں ہی چھوڑ آئے ہیں۔ دراصل ہمیں دوسروں سے مانگنے کی اتنی عادت پڑ چکی ہے کہ اب ہم نے اپنی پیداوار والا سلسلہ ختم ہی کر دیا ہے۔ ہاں البتہ شاعروں کی پیداوار میں ہم کفالت کی منزل حاصل کر چکے ہیں"۔ گویا "مکان مل نہ سکا شاعری الاٹ ہوئی" والی صورت حال بن چکی ہے۔ دانشور خان کی باتوں پہ ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو مجھے بھی ان کا ہم خیال بننا ہی پڑا کہ واقعی یار! شاعر ہمارے ہاں بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں اور آج بھی ان کی پیدائش کی شرح خطرناک حد تک تیز ہے.....!!۔

اب تو دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ ہمارے ملک میں ہر شے اتنی وافر مقدار میں پیدا کر دے جس قدر یہاں شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی وہ واحد جنس ہے جس میں ہم خود کفیل ہیں اور ہمیں انہیں باہر سے نہیں منگوانا پڑتا۔ بقول شخصے ایک پتھر اٹھائیں تو نیچے سے نو دس شاعر نکل ہی آتے ہیں۔ چلو یہ بھی غنیمت ہے کہ کم از کم اس ضمن میں ہمیں دوسرے قوموں کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا ورنہ تو ہمیں ہر شے کے لئے سرحد کے پار دیکھنا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں سب سے آسان کام شاعر بننا ہی ہے۔ ادنیٰ! سے ادنیٰ! اور چھوٹے سے چھوٹا شاعر بھی اتنے اشعار کہہ جاتا ہے کہ مختصر سے عرصے میں اس کی تین چار کتابیں مارکیٹ میں آ چکی ہوتی ہیں اور خاص و عام سے سند قبولیت کی متمنی ہوتی ہیں۔ صاحب کتاب ہونے کا اپنا ہی ایک نشہ اور اپنا ہی مزہ ہے۔ کتابیں چونکہ اپنے خرچے پر چھاپنی پڑتی ہیں اس لئے کسی کو یہ دیکھنے اور پرکھنے کا حق نہیں پہنچتا کہ کیا کچھ چھپ رہا ہے۔ اب ان کتابوں کو قبول عام نصیب ہوتا ہے یا نہیں اور اگر شاعر مقبول ہوتا ہے تو کیسے؟ یہ ایک الگ اور طویل بحث ہے اور اس موقع پر اس سے گریز ہی مناسب لگ رہا ہے۔ بعض شاعر تو محض چند غزلوں پر ہی سالہا سال تک مشاعروں کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں اور ہر دفعہ:

وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

کے بل بوتے پر مسلسل شہرت سمیٹتے رہتے ہیں۔ بہرحال زور و شور سے شاعری ہو رہی ہے۔ گلی گلی مشاعرے ہیں۔ ہر ایرا غیرا مشق سخن جاری رکھے ہوئے ہے اور پورے ملک میں شعر پاشی کی جا رہی ہے۔ خوب واہ واہ بھی ہو رہی ہے۔ داد دیئے جا رہے ہیں،

حوصلے بڑھتے چلے جارہے ہیں اور ہم جیسے سخن ناشناس سر پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ اے اللہ!! یہ آخر اس قوم کو ہو کیا گیا ہے اور یہ ہم کس طرف کو جارہے ہیں۔؟

بہت عرصہ پہلے محترم مشتاق مولائی صاحب یہ کہہ کر شاعری سے ہاتھ اٹھا چکے تھے اور ایک طرح سے دستبرداری کا اعلان کر چکے تھے کہ.....

میر و غالب کے جنازے اٹھ چکے
اب کہاں کی معتبر ہے شاعری

.....

مگر ہم نے ان کی پکار اور فریاد پر کان نہیں دھرے۔ اقبال بھی تو ان پر اعتراض کر بیٹھے تھے کہ.....

شاعر بھی ہیں پیدا علماء بھی حکماء بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

.....

ان کے خیال میں بھی شاعر حضرات غلاموں کو غلامی پر رضامند کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اس لئے ان سے بچ کر رہنا ہی مناسب ہے۔

چند مہینے پہلے ایک موقر قومی روزنامے میں کسی ماہر دانشور کا بیان شائع ہوا تھا۔ صاحب موصوف نے لکھا تھا کہ ملک میں بہت بے روزگاری ہے اور بے روزگاری میں اضافے کے سبب روز بروز ہمارے ہاں شاعروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب پتہ نہیں بے روزگاری سے اس کا کوئی تعلق ہے یا نہیں مگر شاعروں کی بڑھتی تعداد پر میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ تعداد میں اضافہ بری بات نہیں اور نہ ہی کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس اعتراض ان کی شاعری کے معیار اور انداز پر ہے۔ بعض اوقات اتنے گرے پڑے شعر اور اتنی پست موضوعات سامنے آتی ہیں کہ سننے والے کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ محبوب ان صاحبان کی شاعری کی چھلنی سے گزر کر محبوب کہلانے کے قابل نہیں رہتا بلکہ ان شاعروں کی بیاض کے اندر وہ اپنی عزت، وقار، احترام، اور حسن سب کچھ ہار جاتا ہے۔ محبوب کے بدن کی تراش ہی ان کا من پسند موضوع ہوتا ہے۔ اگر ان کی شاعری سے محبوب کو نکال دیا جائے تو پیچھے صرف سفید ورق ہی رہ جاتے ہیں۔ یہ حضرات گھر سے نکلتے ہی فقط شکار کے تلاش میں ہیں۔ جہاں کوئی فارغ بندہ نظر آیا، جھٹ سے اپنی پٹاری کھول کے تازہ کلام سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں نہ یہ موقع دیکھتے ہیں اور نہ محل، سامنے والے کے ذوق سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ ہر حال میں ان کو اپنے اشعار سے مستفیض کرا کے ہی چھوڑتے ہیں۔ خواتین بھی ماشاء اللہ اس کار خیر میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کے پاس لفظوں کے بارود کے ساتھ ساتھ حسن کا ہتھیار بھی موجود ہوتا ہے جسے وہ بے دھڑک

استعمال کرتی ہیں - انہیں مردوں کے مقابلے میں پذیرائی بھی زیادہ ہی ملتی ہے کیوں کہ ہم پاکستانی ویسے بھی حسن کے شیدائی ہوتے ہیں ؛ جہاں ہمیں حسن نظر آئے فوراً ہی اس کے چوکھٹ پہ سر کو جھکا دیتے ہیں- مادہ پرست تو ہم ہیں ہی - ان نازنینوں کو داد شاعری سے زیادہ ان کی تصویر پہ ملتی ہے جو اصل سے بڑھ کر حسین ہوتی ہے- بہر حال شاعری ہو رہی ہے جس کا معیار روز بہ روز گر رہا ہے - ان ہی شاعروں کے بارے میں مولانا حالی مرحوم کو دل پر جبر کر کے کہنا ہی پڑا تھا ---

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

.....

محترم مشتاق احمد یوسفی تعلیم یافتہ خواتین اور ان کے پکائے ہوئے بدمزہ پکوانوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آخرت میں سزا کے طور پر ان خواتین کو ان ہی کے ہاتھوں کے پکے کھانے زبردستی کھلائے جائیں گے- اسی اصول کے تحت میرے خیال میں ان شاعروں کو باندھ کر انہیں ان کا کلام زبردستی سنایا جائے گا - فرشتے انہیں گرز مار مار کر انہیں ان ہی کا کلام سننے پر مجبور کریں گے- اور یہی ان کی سزا ہوگی-

شاعری ایک عطیہ خداوندی ہے اور اللہ کی جانب سے خاص بندوں کو ہی ودیعت ہوتی ہے- اس لحاظ سے یہ ایک مشکل ذمہ داری ہے مگر ہم نے فقط قافیے ملانے اور وزن برابر کرنے کو شاعری سمجھ لیا ہے- اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے یہ شاعر شعر کہنے سے زیادہ اسے دوسروں کو سنانے کے آرزومند رہتے ہیں- اقبال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شعر سننے سنانے کے حق میں بالکل نہیں تھے اور نہ ہی داد لینے یا دینے کے مشتاق تھے- چنانچہ اس قسم کے کوئی شاعر ان کے سامنے آتے تو وہ انہیں سختی سے منع کرتے- وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک چور کسی شاعر کے گھر چوری کی نیت سے جا گھسا اور بدقسمتی سے وہاں پکڑا گیا- سزا کے طور اسے پوری رات شاعر محترم کے کلام کو سننا اور داد دینی پڑی - ہاں اس سزا کے بعد اس نے کبھی بھی چوری نہ کرنے کی قسم کھالی اور تائب ہو گیا-

میرا ایک جاننے والا بلکہ عزیز ہے اور اکثر سامنا ہوتا رہتا ہے ، یک بیک اسے یہ بیماری لگ گئی - افسردہ افسردہ سا رہنے لگا ؛ سرد آہیں بھرنے لگا اور قافیے ملا کر اشعار کہنے شروع کیے - محبوب کی مست جوانی ، ناگن زلفوں اور ترچھی نگاہوں کی راگ الاپنے لگا - چند دن تک تو میں تماشا دیکھتا

رہا لیکن جب اس نے اپنے زریں خیالات و محسوسات سے مجھے بھی متاثر کرنے کی کوشش شروع کی تو مجھے اسے راہ راست پر لانا ہی پڑا - پتہ چلا وہ محلے میں ایک گوالن پر عاشق ہو چکا ہے اور اس کی ہجر میں تپ رہا ہے - ایک دن مجھے اپنی معشوق کا تماشا دکھانے ایک بلند ٹیلے پر لے گیا جہاں سے اس کا گھر واضح نظر آ رہا تھا - موصوفہ اس وقت گھر کے چھت پر موجود تھی اور اوپلے تھاپ رہی تھی - گول گول چپاتی نما اوپلوں سے دیواریں بھری ہوئی تھیں - بہت ہنسی آئی، کہا" بندہ ئے خدا !! تجھے عشق رچانے کے لئے کوئی اور نہیں ملی " - کہنے لگا؛ بھائی جان ! ذرا اس کی چال تو دیکھیں اور دیکھو کتنے متناسب گول روٹی نما اپلے بنا لئے ہیں - اور ترچھی نظروں کے تیر تو دیکھیں، کس طرح دل کے پار ہوتے ہیں - میں نے کہا خدا کے بندے ! اس میں ماسوا اس کے کہ یہ صنف نازک قسم کے مخلوق سے تعلق رکھتی ہے، کوئی اور خوبصورتی والی بات دکھاو - رہی بات ترچھی نگاہوں کی تو عقل کے اندھے ! یہ ترچھی نظریں نہیں ہیں بلکہ یہ تمہاری محبوبہ بھینگی ہے، سیدھا دیکھ ہی نہیں سکتی کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا ؟؟ - دائیں طرف دیکھتی ہے تو بائیں جانب نظر آتا ہے اس لئے ہر کوئی سمجھتا ہے میری ہی طرف دیکھ رہی ہے - اگر اپنی شاعری کے لئے محبوبہ ڈھونڈنی ہی ہے تو یار ذرا ڈھنگ کی تو ہوتا کہ کم از کم اسے محبوبہ کہتے اور لکھتے ہوئے بندہ شرمندہ تو نہ ہو - بولے، " حسن محبوب کے سراپے میں نہیں بلکہ اپنی آنکھوں میں ہوتا ہے جناب : کاش تم اس حسینہ کو میری نظروں سے دیکھ سکتے.....!!! اور میں نے واقعی شکر ادا کیا کہ میں اس مخلوق کو اس کی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا -

شاعری کا جن اتارنے کے لئے اگلے دن اسے اپنے سینئر دانشور دوست کے پاس لے گیا جس نے چند منٹ تک اس کی بیاض کا مطالعہ کیا - اس دوران وہ ساعت بہ ساعت بیاض سے نظر اٹھا کر سر سے پیر تک صاحب بیاض کا جائزہ بھی لیتے رہے اور مل آخر دس پندرہ منٹ بعد انہوں نے بیاض بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بولے، " دیکھو بیٹا ! عشق کے وقتی تاثر کے تحت تم نے قافیے ملا کر شعر تو بنا لئے ہیں مگر ابھی تمہارے خیالات کچے اور خام ہیں؛ اگر تم برا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں جو میرے خیال میں آپ اور آپ کے خاندان دونوں کے لئے فائدہ مند ہوگا ؟؟

شاعر صاحب کہنے لگے، " ہاں جی کیوں نہیں؛ آپ فرمائیں تو سہی .....!!

دانشور دوست بولے، " میری مانو اور کوئی کام اور روزگار شروع کر کے خود کو مصروف کر لو - شاعری وغیرہ کو گولی مارو - ایسا کر کے تم نہ صرف اپنے آپ بلکہ اپنے خاندان پہ بھی احسان کرو گے - "

☆☆☆☆☆

Lock Down

زنداں کی تصویر بنے ہیں، گلیاں، کوچے، گھر، بازار
ہر منظر ہے تھکا تھکا سا، ساری آنکھیں ہیں بے زار
ہر جانب اک ہُو کا عالم
پہلے سے ناشاد دلوں میں دہشت بھرتا جاتا ہے
اپنے آپ سے باتیں کرتا، سناٹا
شریانوں کے اندر جیسے پل پل اُترا جاتا ہے

دروازوں پر گرد ہے ایسی جیسے کھلنا بھول گئے ہوں
لمحے، یوں خاموش کھڑے ہیں جیسے چلنا بھول گئے ہوں
اپنے گھر کی دیواریں بھی دشمن جیسی لگتی ہیں
تنہائی کے سُونے پن کی گھائل سی یکسانی میں
آنکھیں ڈرنے لگتی ہیں

یوں لگتا ہے جیسے یکدم وقت کا پہیہ ٹھہر گیا ہو!!
گزرے موسم لوٹ آئے ہوں، بہتا دریا ٹھہر گیا ہو!
اندھے سے اک موڑ پر آ کر
چُپ سے کھڑے ہیں ارض و سما
اور اُن کی وسعت کے ہوتے
اپنے گھر میں قیدی بن کر سمٹے گی یوں خلقِ خدا
کب یہ کسی نے سوچا تھا؟

امجد اسلام امجد

۔۔۔۔کی سالگرہ پر

☆

دل گیر سے ہوتے رہتے ہیں
تری یاد میں روتے رہتے ہیں
ماضی کے حسیں لمحے ہم کو
نشتر سے چبھوتے رہتے ہیں
اب تک یہ حالت ہے اپنی
بے حال سے ہوتے رہتے ہیں
اشکوں کے موتی چن چن کر
ہم ہار پروتے رہتے ہیں

خوشیوں کے جو لمحے آئیں انہیں
اشکوں میں ڈبوتے رہتے ہیں
تری سالگرہ کے دن بھی ہم
ہنستے نہیں ، روتے رہتے ہیں

تسلسل

تو جب شہزادہ باغی ہوگیا
اور شاہ کے سر کو فصیلِ شہر سے لٹکا کے
اطمینان سے لوٹا
محل کے اِک جھروکے سے
یہ منظر اُس کے بیٹے نے بھی دیکھا
اور تھوڑی دیر گم صم سا رہا،
پھر اُس نے اپنے باپ (شاہِ وقت) کے
سر پر نظر ڈالی۔

نسیمِ سحر

نجیب احمد کہاں ہے تو؟

یہی لگتا ہے
بلوایا ہے

تجھ کو خالد احمد نے
اکیلے پن سے گھبرا کر

یقیناً قاسمی صاحب نے
بھی اس سے کہا ہوگا

بہت دن سے
غزل اس نے
نہیں بھیجی
مگر تازہ بیاض
اس کے
کلام و عکس سے
ہرگز نہیں خالی

نجیب احمد
کہاں ہے تو
تجھے ہم کس طرح
ڈھونڈیں

گلزار بخاری

نجم حسین سیّد

نجم حسین کا نام ہے پیارا

دیدہ وروں کا راج دُلارا

جیون میں اک نابغہ دیکھا

آلائش سے پاک اجیارا

ہندسوں کی دنیا کا پارکھ

سونے کو سمجھے سنیارا

کٹتے پیڑوں کا دکھ جانے

کیسے کوئی آری آرا

جنگل کی ساری دولت ہی

لے جاتا ہے لکڑہارا

لیکن جاننے والا جانے

درد کی دنیا کا غم سارا

ادبی چرخ کا قطبی تارا

نجم حسین کا نام ہے پیارا

گلزار بخاری

کرامت بخاری

رات

تصور کی تلاطم خیز موجیں
مرا سارا بدن کشتی کی مانند
اُبھرتا ڈوبتا، ہچکولے کھاتا
غموں کے بے کراں ساحل پہ اُترا
تو اُس ساحل پہ ایسی رات آئی
کہ جی بھر کے میں سویا اور جاگا
مگر وہ رات باقی بچ گئی تھی

دل

میرا مجبور، مہجور محصور دل
میرے پہلو میں ہے کب سے سویا ہوا اور کھویا ہوا
میرا ہمدم بھی ہے میرا ہم راز بھی
اک دھڑکتا ہوا سرمدی ساز بھی
یہ مرا جسم بھی میری آواز بھی!
میرا معصوم، مغموم مظلوم دل
یہ محبت سے دُوری پہ مائل نہیں
یہ کسی مصلحت کا بھی قائل نہیں
اور خرد اس کی راہوں میں حائل نہیں
میرا قلبِ تپاں، ناتواں، نوحہ خواں
خون کے آنسوؤں میں بھگویا ہوا اور رویا ہوا
میرے پہلو میں ہے کب سے سویا ہوا

جب آنسو کام نہیں کرتے

کچھ آنسو بہت ضروری ہیں

آنکھوں کو جو شفاف رکھیں

اِس آئینے کو صاف رکھیں

لیکن اِک موسم آتا ہے

جب گرم ہوائیں چلتی ہیں

جب ہجر سے آنکھیں جلتی ہیں

تب ہونٹ کلام نہیں کرتے

اور آنسو کام نہیں کرتے!

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اشک غزال بھڑک اُٹھے تو کس صحرا جا نکلیں
یہ دل اک وحشت کا گھر ہے، یہ پامال نہ کرنا

استغاثہ

کیوں نہ میں تجھ سے کہوں اے مالکِ یومِ نشور!
بے نواؤں کی نوا تجھ تک پہنچتی ہے ضرور

وقت کے حاکم گرفتارِ انا و کبر ہیں
ذہن میں ان کے سمایا ہے نہ جانے کیا فتور

بے یقینی کے بھنور میں ہیں اندھیروں کے اسیر
اے خدائے حسن و خوبی اے خدائے رنگ و نور!

جہل کی ہے حکمرانی ہر در و دیوار پر
مالکِ علم و ہنر اے خالقِ حسنِ شعور!

لوگ بھوکے ہیں کوئی تو رزق کی صورت بنے
اے خدائے من و سلویٰ اے خدائے کوہِ طور!

بے گھری ہے لوگ سوتے ہیں کئی فٹ پاتھ پر
ان کی جانب بھی کرم کی ہو نظر ربِ قصور!

صاف پانی بھی نہیں موجود پینے کے لیے
مالکِ تسنیم و کوثر مالکِ غلمان و حور!

نارسائی ہے کسی کی کوئی سنتا ہی نہیں
مالکِ کون و مکاں اے خالقِ نزدیک و دور!

دامنِ امید ثاقبؔ نے کبھی چھوڑا نہیں
ہاں مگر جو بات دل میں تھی وہ کہہ دی ہے ضرور

منظور ثاقب

نثری نظم

ہم دونوں کو
برف بہت بھلی لگتی تھی
سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی شام
برف کی ہلکی ہلکی پھوار میں
ہم دونوں
لمبی ویران سڑک پر چہل قدمی کو نکلے
کچھ دیر بعد میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے
دستانے اُس کو دیئے
بہت دیر بعد..... چلتے چلتے
اُس نے میرا سردی سے یخ ہاتھ تھام کر کہا
تمھارا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے!''
'اور ٹھنڈے ہاتھ بے وفا لوگوں کی نشانی
ہوتے ہیں'
اب اس کو مجھ سے اپنے راستے الگ کیے
کئی برس گزر چکے ہیں
پھر سردیوں کی ٹھٹھرتی شام ہے
میں اکیلا ویران سڑک پر چہل قدمی کو نکلا
سوچ رہا ہوں
ہم دونوں میں
کس کے ہاتھ کتنے ٹھنڈے تھے؟

طلعت شبیر

پانچ برسوں کا دکھ

یہ سگریٹ کی ڈبیہ محبت نہیں
لیکن اس میں پڑی سگرٹیں
مجھ میں پھیلی اداسی کے بارے میں
جو سوچتی ہیں
محبت کے جذبے سے کم بھی نہیں
یہ سگرٹ!!
مرے ہونٹ کے لمس کے جتنے عادی ہیں
شاید ترے ہونٹ بھی اتنے عادی نہ ہوں
عمر اپنی جگہ!!
دکھ مساموں میں در آئیں تو
سال و سن جتنی تیزی سے کٹتے ہیں
تیرا بدن اس کی تفصیل کا ایک شہکار ہے
جانے میں آج کل سگرٹیں پھونکتا
تیرے بالوں میں آئی سفیدی کے بارے میں
کیوں سوچتا ہوں؟
میں جو مصرعوں کی مستی میں ڈوبا ہوا

راکھ سگریٹ کی دامن پہ گرتی ہوئی
جھاڑتا تک نہیں
تیرے بالوں میں آئی سفیدی سے خاصا
پریشان ہوں
سال ہا سال ہم نے
محبت کے ہاتھوں بہت دکھ اُٹھائے ہیں
وہ بھی جو اپنے سگے دکھ نہ تھے
رائیگانی کے ٹھیکے کی بولی لگاتے ہوئے
اپنی جیبوں کو ہم نے ٹٹولا نہ تھا
(آج بھی جس کی اقساط بھرتے ہیں ہم)
خامشی زہر ہے
غم کے ماروں کے حق میں تو اک زہرِ
قاتل ہے یہ اس لیے میری جاں
کچھ بھی بولو، بھلے جھوٹ ہی کیوں نہ ہو
تیری حسرت بھری چپ
مرے دل کو مٹھی میں لینے کو بے تاب ہے

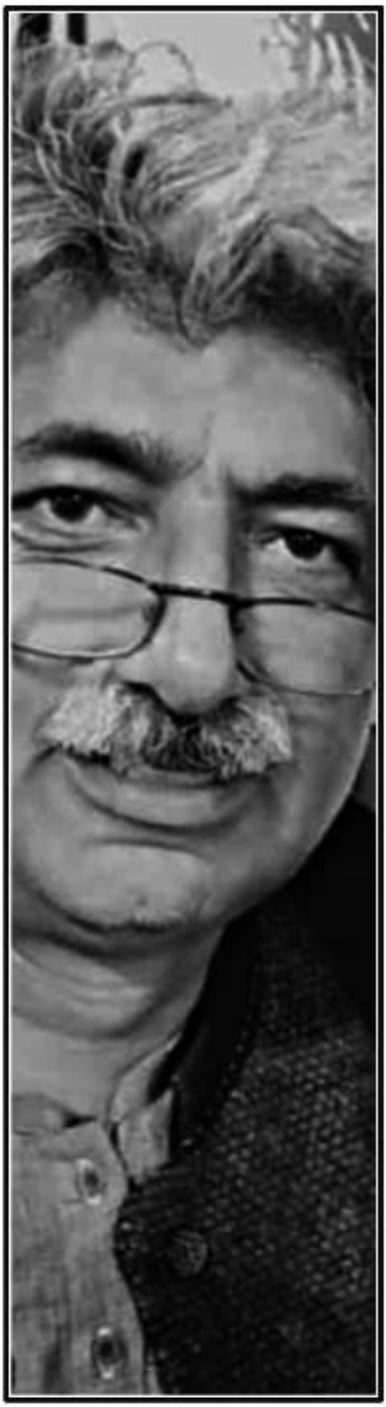

اس سے پہلے کہ یہ مجھ پہ حملہ کرے

خامشی توڑ دو

اپنی انیس برسوں کی تصویرِ غم

جس کو مٹی کی زینت بنے

پانچواں سال ہے

آج چوبیس برسوں کی ہونے کو ہے

کس کو معلوم ہے؟

یہ ہنسی جو ہمارے لبوں کے تصرف میں ہے

سوگ ہے

زندگی جس کی تہمت اٹھائے ہیں ہم

وہ بھی اک روگ ہے

پانچ برسوں کا دکھ

دیکھتے دیکھتے

اپنے انیس برسوں کے آلام پر ایسے بھاری ہوا

جیسے میری جوانی پہ تیری محبت کا آسیب

طاری ہوا

کبیر اطہر

''بھکارن''

چاند سا چہرہ
جس کی خاطر... اک عرصے سے
جنگل جنگل... بھٹکا تھا میں
اس کا نقشہ... ذہن کے اندر
روپ نگر میں... قائم دائم
چپ کی سوچوں... میں گم ہو کر
دیکھ رہا تھا... سوچ رہا تھا
اک دن پھر فٹ پاتھ پہ بیٹھی
ہاتھوں میں کشکول لیے
ایک بھکارن مانگ رہی تھی
میں نے فوراً پھر یہ سوچا
وہ تو بس ہے ایک بھکارن...
جو تھی میرے دل کی رانی
مجھ میں، اس میں فرق ہی کیا ہے؟
وہ بھی پیسے مانگ رہی ہے
لیکن مجھ کو
ایک نظر کی... بھیک وہ دے دے
میری خالی آنکھوں کا کشکول وہ بھر دے
میرا من ہے پیاسا صحرا
اس کی پیاس بھی بجھ جائے گی
رو رو میں نے رات گزاری
وہ ہے ایک بھکارن تو کیا؟
میں بھی تو ہوں ایک بھکاری

اقبال سروبہ

نظم

تیز ہوا کا شور بڑا تھا

پتے سر پر بکھر رہے تھے

دور سڑک پر دھوپ کھڑی تھی

میرا رستہ دیکھ رہی تھی

دل میں اک کہرام مچا تھا

ننھا بچہ چیخ رہا تھا

کوئی تو میرا دکھ پہچانے

کوئی تو مجھے گلے لگائے

فلک کی جانب دیکھ رہا تھا

رب سے روٹی مانگ رہا تھا

سارے ہی خاموش کھڑے تھے

اِک دوجے کو دیکھ رہے تھے

امین کنجاہی

افسانہ سچ نہیں ہوتا

[نثری نظم]

افسانہ سچ نہیں ہوتا
نام بھی فرضی
(خودساختہ میکانکی تکنیک جیسا)
جسے خواہش کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے
کام بھی
مرضی کے خلاف
ذاتی شناخت اور تعارف میں جعلی پہچان
کا باعث ہے
جسے وقت اور حالات مخصوص تخلیقی عمل
سے گزارتے چلے آئے
خوش نصیبی سے چند لوگ ہیں استفادہ کرتے ہیں

قسمت کے گوشوارے میں
رشتے ہندسوں کی طرح ہوتے ہیں
خودفریبی کے حصار میں
طاقت کا نشہ بے لگام گھوڑے کی طرح
خواہش کے کیرم بورڈ پر بھاگتا ہے
نیم مدہوشی میں
اعتدال کا توازن قائم نہیں رہتا

ہم اکثر
کرسی کے ملائم لبوں کا بوسہ لیتے ہوئے
نادار لوگوں کی غریبت کا مذاق اڑاتے ہیں

ریشمی لحافوں میں چھپے کھلونوں سے
ذاتی ہوس کی خانہ پری کرتے ہیں
توبہ کے دروازے
متقی افراد کے لیے کھلے رہتے ہیں

زندگی میں
خوابوں کی طوطا فال ہو
چاندی کی دیواروں میں چھپے تعویذ
مشکل وقت میں کہاں کام آتے ہیں

لالچ کے شہر میں
ہم اپنی خواہش کا فلٹر پلانٹ لگا کر
پیاسوں کو دعوت نامے بھیجتے رہتے ہیں
جی حضوری میں
کبھی مطلب کے بت تراش لیتے ہیں
قہقہے کی خاموشی میں حسن بھانپ لیتے ہیں
بے ساختہ گفتگو سے
بند کمرے میں خراٹے
رات کی تنہائی کا حسن پائمال کرتے ہیں

ہم بے کار لمحوں کی مستند گواہی کا حوالہ
تاریخ کے سیاہ اوراق کی سرگزشت ہیں
جسے زمانے کی خوش خبری میں آگے بڑھنا ہے

امجد بابر

اس قوم کی بیٹی

پروردۂ ایمان ہے، اس قوم کی بیٹی
عفت کی نگہبان ہے ، اس قوم کی بیٹی

رشتہ نہیں اس کا کسی بے راہ روی سے
رحمت کا وہ سامان ہے ، اس قوم کی بیٹی

خود اس کو بھی معلوم نہیں اپنی حقیقت
جس شان کے شایان ہے ، اس قوم کی بیٹی

کب اس کا تعلق ہے کسی فتنہ گری سے
جب پیرو قرآن ہے ، اس قوم کی بیٹی

نسبت ہے اسے سیدہ زہرا کی حیاء سے
عظمت کی وہ برہان ہے ، اس قوم کی بیٹی

یہ کون ہیں جو مجھ کو کہے جاتی ہیں بدنام
اس بات پہ حیران ہے ، اس قوم کی بیٹی

دشمن کی ہر اک چال پہ اب اس کی نظر ہے
یوں صاحبِ عرفان ہے اس قوم کی بیٹی

اک فخر ہے اک ناز ہے ہر فرد کو سرورؔ
اس خطے کی پہچان ہے، اس قوم کی بیٹی

سرور حسین نقشبندی

بیٹی

خدا سے مانگنے لگتا ہوں میں تقدیر بیٹی کی
نگاہوں میں اُتر آتی ہے جب تصویر بیٹی کی

وہؐ بی بی فاطمہؓ کے واسطے اُٹھ کر کھڑے ہوتے
نبیؐ نے کر کے دکھلائی ہمیں توقیر بیٹی کی

میں جب مایوسیوں کی تیز آندھی سے بکھرتا ہوں
ہمیشہ باندھ لیتی ہے مجھے زنجیر بیٹی کی

وہ ناداں لوگ ہیں جو بیٹیوں کو بوجھ کہتے ہیں
کہ رحمت بن کے آتی ہے سدا ہمشیر بیٹی کی

کبھی اُس گھر کے آنگن میں اندھیرا ہو نہیں سکتا
ہر اک گوشے میں ہوتی ہو جہاں تنویر بیٹی کی

میں بیٹی کو کسی صورت پرایا دھن نہیں کہتا
کہ اِس ہجرت میں ہوتی ہے کہاں تقصیر بیٹی کی

تو اِس کی آنکھ میں آنسو کبھی آنے نہ دے ارشدؔ
سرِ افلاک جاتی ہے صدا، دلگیر بیٹی کی

ارشد محمود ارشد

نثری نظم

نابینا شہر میں بینا کی تلاش"

سنا ہے الو کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے

اسے اندھیرے میں دور دور تک دیکھنے کا

ملکہ حاصل ہے

سوسنا ہے کہ کور چشموں نے الو سے آنکھیں

مستعار لے لی ہیں

اور تاریکیوں میں نادیدہ شکار تلاشتے

رہتے ہیں

سرکنڈوں پر پھول کھلنے لگے ہیں

کیکر پر نیم کی پھلیاں اگ آئی ہیں

کنول نے ندی میں کود کر خودکشی کر لی ہے

سب نیکوکار بیٹھے کنول کو جنت یا دوزخ میں

بھیجنے کے فیصلے کے منتظر ہیں

کتے آسمان کی طرف منہ کر کے بھونکیں تو

آسمان سے نحوست برستی ہے

سو سلطنت پر بوجھ نہ پڑے

شاہِ وقت نے کتے مارنے کا حکم نامہ جاری کر

دیا ہے

تخت بچانے کے لیے اتنا قتلِ عام تو جائز ہے

سورج پچھم سے نکلا ہے

چاند نے گرہن کا لبادہ اوڑھ لیا ہے

اُلو اب دیکھ نہیں سکتے

کور چشموں نے انکی آنکھیں نگل لی ہیں

اس سے پہلے کہ تاریکی روح میں گھر کر جائے

اور شہر کا شہر اندھیرے کے سمندر میں ڈوب

کر اپنے آپکو موت کے عفریت کے

حوالے کر دے

نابینا شہر میں کسی بینا کی تلاش جاری ہے

نائیلہ راٹھور

خدا

[نثری نظم]

کہیں سنا تھا
انسان کا خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا
پہلے
جب زندگی کی سمجھ نہیں تھی
تو اس بات کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی
سوچتی تھی کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے
ہمارے آس پاس تو اتنے لوگ ہیں
جو ہمارا ساتھ دینے کے لیے
ہمیں سنبھالنے کے لیے
ہمہ وقت تیار ہیں
پھر آہستہ آہستہ زندگی کی سمجھ آنے لگی
سب ساتھ چھوڑنے لگے
آخر جان گئی
زندگی کا مقصد جان گئی
زندگی کا اصل ساتھی کون ہے جب
ہم ٹوٹ جاتے ہیں
جب غم اتنا بڑھ جاتا ہے
کہ سانس لینا بھی مشکل ہوجاتی ہے
تو ساتھ کوئی نہیں ہوتا
صرف خدا ہوتا ہے صرف خدا
سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
سب زندگی میں آتے ہی
ساتھ چھوڑنے کے لئے ہیں
جو ٹھہر جاتا ہے
جو ہر قدم پر ساتھ کھڑا رہتا ہے
وہ خدا ہے

ضحیٰ خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے ناقد میں کوئی موم کا پتلا تو نہیں
کوئی کس طور مرے قد سے گھٹا دے مجھ کو

خطوط

آصف ثاقب

عزیز جاں بیاض رقم عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
مجلّہ شہرادب لاہور بیاض (اپریل) باعث فخر وانبساط ہوا۔ لاہور کی ادبی عظمتوں کی بھرپور عکاسی تو خیر نہیں ہوسکی۔ پھر بھی لاہور سے محبت اور لاہور کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ لکھنے والوں نے لاہور کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنا کر پیش کیا اور اس پر صدقے قربان گئے ہیں۔ 'بیاض' کے حوالے سے خالد احمد کے اثرات کا ذکرِ خاص ہوا ہے جو دل کو لگا ہے۔ آپ جانیں خالد احمد نے اردو شاعری کو امیجری، ڈکشن اور گفتگو کی ایسی ایسی نوعیتیں دی ہیں کہ سامنے والا شدت جذبات سے شاعر کا دم بھرنے لگتا ہے خالد احمد کی شاعری سطحی نظر کا تقاضا نہیں کرتی وہ گہرائی اور بھرپور مطالعے سے رام ہوتی ہے۔ خالد احمد نے تغزل کے جدید تر آہنگ سے لاہور میں شعریت کا نیا سماں پیدا کیا ہے۔ اس سے متاثرین کی تعداد ماشاءاللہ کم نہیں۔ تغزل کے روایتی رجحانات کو نئی صورت دینے میں سیف الدین سیف بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سیف الدین سیف کا لاہور کی شعریات کی رونقوں میں بڑا حصہ تھا انھوں نے فلمی نغموں میں بھی جودت طبع کی تغزلانہ مظاہر بہم کیے ہیں ان کا گیت تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے سُر اور غزلیت کے امتزاج سے دل لوٹ لیتا ہے، سیف کی گیتوں کی کتاب میں یہ گیت موجود ہے۔ فلمی گیتوں میں ادبی چاشنی اور نغمگی استوار کرنے میں قتیل شفائی کی بڑی حیثیت ہے۔ اس باب میں نئے پیٹرن کو برتنے میں بہت سوں نے قتیل کی پیروی کی ہے۔ گویا فلمی نغموں کے سرمایۂ ادب کو لاہور نے زیادہ متمول کیا ہے۔ اور جگہوں میں لاہور ہی کی لہروں کی اُٹھان دیکھی جاسکتی ہے۔ لاہور حسن و خوبی میں بے ہمتا اور یکتا ہے جو شخص پہلی بار وہاں جاتا ہے اُسے کہا جاتا ہے آپ اب پیدا ہوئے ہیں۔ لاہور لاہور ہے جندا روئے۔

خیر اندیش

جمیل یوسف

جناب عمران منظور صاحب!
السلام علیکم!
ماشاءاللہ، عالمی سطح پر لاہور کے شہرادب قرار دیئے جانے پر 'بیاض' نے سب سے پہلے گوشۂ لاہور کا اہتمام کیا ہے پاکستان کے اور کسی ادبی جریدے کو ابھی تک یہ توفیق نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں اولیت کا سہرا 'بیاض' کے سر ہے۔
گوشۂ لاہور میں ادب کے حوالے سے مجھے سب سے زیادہ جناب رانا محمد کا مضمون 'لاہور شہرادب۔ ہم سب کا معشوق'' پسند آیا ہے۔ میں اکثر اپنے خطوط میں لکھتا رہتا ہوں کہ میری پسند، ناپسند کا معاملہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کا انحصار ہمیشہ میرٹ پر ہوتا ہے۔ رانا محمد شاہد صاحب کے مضمون سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ لاہور کے ادبی افق کو اس خوبی سے اجاگر کرنے پر میں رانا صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ زندہ باد
دوسرا مضمون جو مجھے بہت اچھا لگا ہے وہ محترمہ سیدہ آمنہ ریاض کا ''لاہور اسپیشل''۔ یہ واقعی لاہور اسپیشل ہے۔ وہ جو اقبال نے کہا تھا:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

تو واقعی محترمہ نے اپنی شوخ و شنگ اور چٹیھی تحریر سے لاہور کی تصویر میں رنگ بھر دیا ہے۔
لاہور کے شب و روز کے بارے میں اس پُر لطف تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں محترمہ نے اپنا ذکر کہیں بھی نہیں کیا۔ ہمارے اکثر لکھنے والوں میں سب سے بڑی خامی اور خرابی یہ ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو وہ اپنا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اہم شخصیات ہیں اور قارئین ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر بلکہ اپنی ذات کو منہا کر کے بات کرنا ہی سچے اور کھرے تخلیق کاروں کا شیوہ ہوتا ہے۔
'بیاض' کے بانی ایڈیٹر اور لاہور کی بے مثال اور باکمال ادبی شخصیت محترم خالد احمد کو میں نے کبھی اپنی تحریر یا گفتگو میں اپنا ذکر گھسیڑتے ہوئے نہیں پایا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہارون الرشید

محترمی جناب عمران منظور و نعمان منظور صاحبان!
السلام علیکم!
کچھ مصروفیات کی وجہ سے کئی ماہ تک 'بیاض' کی محفل میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن اس دوران باقاعدگی سے اس کا مطالعہ جاری رہا۔ احباب کی تحریریں بھی توجہ سے دیکھیں۔
'بیاض' کے تازہ شمارے کو آپ نے شہر ادب لاہور کے نام معنون کیا ہے، بہت اچھا لگا۔ یونیسکو نے چند ماہ پہلے لاہور کے ادبی مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اسے شہر ادب قرار دیا ہے۔ میری رائے میں لاہور کب شہر ادب نہیں رہا؟۔ لاہور برصغیر کا وہ شہر باکمال ہے جس نے ہر عہد میں نہ صرف اپنی منفرد شناخت بنائی بلکہ اسے نہایت عمدگی سے آگے بڑھایا۔ اس شہر میں ہر دور میں بے مثال تخلیق کار پیدا ہوئے، جن کے فن کی گونج لاہور سے لے کر کلکتہ اور راس کماری تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں یہ مفروضہ لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ اردو ادب کے دو ہی بڑے دبستان دلی اور لکھنؤ ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ لیکن لاہور سے کیسے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔
لاہور کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس عدیم النظیر شہر نے نہ صرف بڑے شاعر اور ادیب پیدا کیے، بلکہ کئی نامور کھلاڑی، مصور، گلوکار، اداکار اور کئی نامور مذہبی اور علمی شخصیات کا بھی اسی سرزمین کے حصے میں آئیں، جن کا فن پوری دنیا میں نہایت عزت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کا مقام بھی بہت بڑا ہے، لیکن لاہور کے اندر جو کشش اور جاذبیت ہے وہ ان شہروں میں نہیں ہے۔ یہاں سے جو ادیب، شاعر، گلوکار، اداکار اور موسیقار ہجرت کر کے دلی، کلکتہ اور بمبئی گئے ان کے اندر سے لاہور کبھی نہیں نکل سکا۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، دیویندر ستیارتھی، گوپال متل، اوتار پریم اور ان کے علاوہ بے شمار لاہور کے عاشق زندگی بھر لاہور کے فراق میں آہیں بھرتے رہے۔
لطیف الزماں (مرحوم) کا 'فنون' کے بتیس سال پہلے ایک شمارے کا مضمون چند دن پہلے دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا، جس میں انھوں نے راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کا ذکر کیا ہے جو بمبئی میں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ راجندر سنگھ بیدی لاہور جانے کے لیے سخت بے تاب تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا انتقال بھی لاہور میں ہو۔ لیکن ان کی یہ تمنا اس لیے پوری نہ ہو سکی کہ وہ ان دنوں سخت علیل تھے اور سفر کے قابل نہیں تھے۔ کینسر کے مریض تھے، چند ماہ بعد چل بسے۔ اس مضمون میں لاہور سے ان کی محبت قاری کو آبدیدہ کر دیتی ہے۔
آصف ثاقب صاحب نے اپنے خط میں ہمارے مرشد احمد ندیم قاسمی اور "فنون" کا ذکر کیا ہے۔ "فنون" لاہور کی ادبی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ 'فنون' آدھی صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکا ہے اور ہنوز سرسبز و شاداب ہے۔ 'فنون' میں ہزارہ سے

تعلق رکھنے والی بڑی علمی شخصیتوں پروفیسر محمد ارشاد اور آصف ثاقب کو برسوں پڑھنے کا شرف حاصل رہا اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ اسی لاہور میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں تین بار احمد ندیم قاسمی کے درشن کیے۔ ان کی یادیں اب بھی ذہن کے نہاں خانوں میں اسی طرح تر و تازہ ہیں، جیسے یہ کل کی بات ہو۔ اسی 'فنون' نے برسوں اس طفلِ مکتب کو بھی نہایت فراخدلی سے اپنی محفل میں جگہ دی اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ 'فنون' کی باگ اب ناہید قاسمی اور ان کے پسر نیر حیات قاسمی کے ہاتھ میں ہے۔ 'بیاض' کے اس شمارے میں کنہیا لال ہندی، امجد اسلام امجد، ابدال بیلا، اسلام عظمی، جمیل یوسف، بشریٰ رحمان، شوکت محمود شوکت، غافر شہزاد، آفتاب احمد ملک، آمنہ ریاض اور رانا محمد شاہد کے مضامین درحقیقت لاہور کی عظمت اور دلبری کے عکاس ہیں۔ لاہور کے علمی و ادبی ستاروں کی تصاویر دیکھ کر لاہور اور بھی حسین لگا اور 'بیاض' بھی۔

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب

بہت احترام اور مسنون سلام!

'بیاض' کا شمارہ بابت اپریل 2021 ہم دست ہوا۔ دل جذبات ممنونیت سے بھرا ہے۔ زیرِ نظر پرچہ کو لاہور نمبر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اگرچہ اس سے بہت پہلے نقوش کے ادارے نے ضخیم لاہور نمبر شائع کیا تھا۔ بہرحال 'بیاض' کا لاہور نمبر بھی ایک خاص شمارہ ہے اور ایک عمدہ کاوش ہے۔ آپ کی ادارتی محنت کی تحسین واجب ہے۔ قبول کیجیے۔ 'بیاض' کا لاہور نمبر پڑھ کر دل شاد ہوا۔

بے شک لاہور شہر اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اسے شہرِ ادب ہونے کا اعزاز دیا جائے۔ 'بیاض' موجودہ ادبی رسائل پر سبقت لے گیا کہ لاہور کو شہرِ ادب قرار دیے جانے پر سب سے پہلے اس جریدے نے دعوت دی کہ ادباء لاہور کو ادب کا شہر ہونے کے حوالے سے مضامین تحریر کریں۔ لاہور نمبر میں شائع ہونے والے یوں تو سب مضامین اپنی اپنی جگہ حامل وقعت اور لائق مطالعہ تھے مگر صرف جمیل یوسف صاحب نے لاہور کے ادبی پس منظر کے حوالے سے جامع مضمون لکھا اور یہ خصوصی شمارہ ایسی ہی تحریر کا تقاضا کرتا تھا۔ رانا محمد شاہد اور غافر شہزاد صاحب نے بھی لاہور کے ادبی پس منظر کو جستہ جستہ پیش کیا۔ دیگر مضامین لاہور سے متعلق ضرور تھے اور دلچسپ بھی تھے مگر ان میں لاہور کا ادبی حوالہ مفقود تھا یا کم کم تھا۔ کنہیا لال کپور کے مضمون میں لاہور کے تاریخی دروازوں کا بیان ہوا ہے۔ بشریٰ رحمن صاحبہ نے لاہور سے وابستہ اپنی یادوں کا ذکر کیا ہے۔ ابدال بیلا صاحب نے اپنے مضمون کو احمد ندیم قاسمی اور دفتر فنون تک محدود رکھا۔ اسلام عظمی صاحب نے بھی لاہور سے متعلق اپنی یادیں تازہ کیں، البتہ کہیں کہیں ادبی حوالہ بھی آیا۔ میری دانست میں تمام مضامین لاہور کی ادبی خدمات کے حوالے سے لکھے جاتے تو عین مناسب ہوتا۔ لاہور شہر نے جتنی خدمت اردو ادب کی ہے۔ ایسی خدمت اردو دانوں کے گڑھ کراچی کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ امجد اسلام امجد نے نظم کی صورت میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ نظم ان کے مضمون پر بھاری رہی۔ دیگر مشمولات بھی پسند آئے۔ حاضری کے لیے ایک غزل ملفوف کر رہا ہوں احباب 'بیاض' کی خدمت میں سلام۔

آفتاب احمد ملک

برادرِ محترم و محتشم عمران منظور جی! سلام نیاز مندانہ!!

وقت کی تیز رفتار لہروں کے سنگ اپریل کا خوبصورت و معلوماتی جریدہ ادب 'بیاض' نظر نواز ہوا۔ یاد آوری و آفتاب نوازی کے لیے بصمیم قلب ممنون ہوں۔

حمد، نعت، عقیدت کے عرفانی اشعار پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ شہرِ ادب۔ لاہور کے حوالے سے قد آور شخصیات جن کا تعلق اس تاریخی شہر سے رہا۔ ان کی خدمات و کارہائے نمایاں پر آپ کے تحریری حکم پر بشمول احقر 13 قلمکار احباب نے اپنے اپنے مشاہدات کے پیشِ نظر معیاری یادوں کا مجموعہ تحریر کیا گویا علمی و ادبی تاریخ کے اوراق پارینہ ہیں، جو ایک

تحریری ریکارڈ 'بیاض' میں محفوظ ہو گیا۔ (صفحہ نمبر 90-25) نیز 10 شعرا کا منظوم لاہور کو خراج خاص اہمیت رکھتا ہے۔ (صفحہ نمبر 91-101)

نئی کتابوں پر تبصرہ جات ادبی نقطہ نگاہ سے خاصا دلچسپ سلسلہ ہے۔

چند افسانے پڑھ کر افسانہ نگار دوستوں کی ذہنی صلاحیتوں کی داد دی جاتی ہے۔ افسانوں کے عنوانات اور مندرجات معاشرتی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی جھلکیاں ہیں۔ "شاہ داستان" جاری و ساری ہے۔ شوکت علی شاہ صاحب نے عمر بھر جو بھی دیکھا۔ تجربات کی روشنی میں دل کی بات قارئین کے قلوب و اذہان میں راسخ کرنے کا بخوبی فن جانتے ہیں۔ نثری شاعری لاجواب ہے۔ سیاحت سے دلچسپی سفرنامہ نگار کی سیلانی طبیعت کا پتہ دیتی ہے۔ مضمون نگار دوستوں کے ادبی شخصیات پر تاثراتی خیالات، کتابوں پر تبصرے، خوبیوں خامیوں کے تذکرے خوب کیے۔ شکیل جاذب کی "نمی دانم"، عزیز عادل کی "شب ریز" فرخندہ شمیم کے افسانوں کا مجموعہ "تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت" امامیہ ڈگری کالج ساہیوال کے میگزین 'باب العلم' (گولڈن جوبلی نمبر) پر واصف سجاد کا تبصرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے (صفحہ نمبر 116-115) غزل و نظم کو شعرا کا تازہ کلام جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایک ایک شعر الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ جن تخلیقی صلاحیتوں کے مالک شاعروں نے متاثر کیا۔ چند اشعار کا انتخاب مذرقارئین ہے:

گیت گاتا ہے محبت کے زمانوں والے
اپنے سُرتال میں نوشاد ہے آصف ثاقب
جس نے کشمیر میں اسلام کو تہذیب کیا
اُس بڑے شخص کی اولاد ہے آصف ثاقب
آصف ثاقب

الحمد وللہ
ہر مشکل کا حل
امجد ، جیون ہے
اُڑتا سا اک پل
امجد اسلام امجد

کوہسار الم سے ٹکرا کر
بین کرتی ہوئی صدا ہوں میں
خود سے کب کا بچھڑ چکا ہوں نجیب
کب سے تنہائی میں پڑا ہوں میں
نجیب احمد

حرفِ کُن مانگتے ہو خالق سے
اہرمن سے نصاب مانگتے ہو
اعجاز کنور راجہ

شاد ہوں اپنی پھٹی چادر میں
کسی مانگی ہوئی اجرک میں نہیں
نسیم سحر

دریائے وقت تیری روانی کی خیر ہو
تُو اس طرف رواں ہے کنارو جدھر نہیں
اسلام عظمی

تُو ہے آباد مجھ میں صدیوں سے
میں کہ پل بھر نہ رہ سکا تجھ میں
رشید آفرین

ہم لکھاری ہیں اس لیے ثاقب
زندگی کو کتاب کرتے ہیں
منظور ثاقب

تو کفن پہنا نہیں سکتی کبھی الفاظ کو
اے اجل ہم کو کتابوں میں سدا زندہ سمجھ
عقیل رحمانی

ساعتوں کو گراں نہیں ہے غزل ہماری
کہ شعر تیرے ہی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں
افتخار شاہد

اشک اشک آنکھوں میں
حرف حرف بھیگا ہوں
ذرہ ذرہ پیاسا تھا
صحرا صحرا برسا ہوں
اقبال سروبہ

پھیل تو سکتی ہے خوشبو ویرانے میں
سخت زمیں پر پھول اگانا پڑتا ہے
الفشاں سجاد

تیری موج تباہ کُن میری
قوت بادبان دیکھے گی
افروز رضوی

چہرے بانٹتی رہتی ہوں پیانوں میں
کوزہ گر کا راز بناتی رہتی ہوں
آسناتھ کنول

زیست ہے میرے ساتھ رقص کناں
یہ غزل ہے رباب ہے تم ہو
انجم جاوید

ہو جن کا ربط کسی حسن دل نواز کے ساتھ
وہ شہر عشق کے در کی کلید ہوتے ہیں
آفتاب خان

میں کے صحرا کا میٹھا چشمہ ہوں
اور کوئی پانی پینے والا نہیں
امر مہکی

طوالت کے خوف سے دیگر شعرا کے اشعار شامل نہیں کر سکا۔ نظموں کے عنوانات پڑھ کر حیرت و خوشی ہوئی۔ اقبال سرو بہ کے دو اشعار غضب ناک ہیں بعنوان ''خانہ بدوش''

ان پکے مکانوں میں
وہ لوگ نہیں بستے
وہ لوگ بھی زندہ ہیں
تم سوچ نہیں سکتے؟

زیر نظر شمارہ میں بعض صفحات کی خالی جگہوں پر بانی مدیر خالد احمد (مرحوم) کے خوبصورت 22 اشعار کا انتخاب اچھا لگا۔

ہاں لاہور کی یادوں کے سلسلے میں 42 مقتدر شخصیات کی تصاویر سے اندرونی ٹائٹل پر دیکھ کر قلبی و ادبی طمانیت ہوئی۔ چند زندہ دیگر (مرحومین) جن کو دیکھا ادبی محفلوں میں سُنا کمال کی رنگین تصاویر چسپاں کی ہیں۔ بقول برادرم سلیم اختر ندیم کہ:

دیکھیے شہر ادب لاہور ہے
شاعروں کا منتخب لاہور ہے
اہل دل، اہل خرد اہل بیاض
سچ تو یہ ہے سب کا سب لاہور

گویا اپریل کا شمارہ خصوصی نمبر لاہور ہے۔ بیاض کی انتظامیہ دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔ فرنٹ ٹائٹل پر مینار پاکستان کی تصویر / خطوط و کتب اور بیک ٹائٹل پر جاذب نظر پاک ٹی ہاؤس 1948 شہر ادب کی عکاسی ہے۔ خطوط نگار دوستوں کی آرا پڑھ کر بے پایاں مسرت ہوئی۔ 6 خطوط شمارہ گزشتہ پر ناقدانہ سطور ہیں۔ 241 صفحات ادبی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ ''بیاض'' کے لیے ڈھیروں دعائیں اور ثمینہ سید کا معنی خیز خوبصورت دعائیہ شعر کہ:

کب سے ہوں میں موسم خوش رنگ کی امیدوار
کب سے ہونٹوں پر ہے اک حرف دعا ٹھہرا ہوا

لاہور کی علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی حیثیت کو اجاگر کرنے میں 'ماہنامہ بیاض' کا اہم کردار رہا ہے۔

انعام الحسن کاشمیری

محترمی مدیر ماہنامہ بیاض
السلام علیکم۔
امید ہے تمام اراکین ادارتی بورڈ بخیر ہونگے۔
حسب معمول بیاض اپریل کا شمارہ وقت مقررہ پر موصول ہوا۔ سرسری جائزہ نے دل موہ لیا۔ بعد ازاں تفصیلی مطالعہ کے دوران پے در پے نئے در وا ہوتے چلے گئے۔ گزشتہ ماہ جناب اعجاز رضوی نے بتایا تھا کہ اپریل کا شمارہ یونیسکو کی جانب سے لاہور کو شہر ادب قرار دیے جانے کے سلسلہ میں متعلقہ مواد پر مشتمل ہوگا تو ذہن میں ایک مشکل اور گنجلک پہلو نے سر ابھارا کہ بیاض ایسا کیونکر ممکن کر پائے گا لیکن جب اپریل کا شمارہ

سامنے آیا تو اولیں صفحہ پر جناب خالد احمد کی "اختر حسین جعفری کے لیے" عقیدت مندانہ اظہار میں ان کی لاہور سے والہانہ محبت کا جو شگوفہ مطلع میں پھوٹا اس نے پوری طرح نہ صرف سرشار کیا بلکہ مطلع بھی کر دیا کہ زیر نظر شمارہ میں لاہور کی بابت کس نوعیت کا مواد موجود ہوگا۔ پھر حمد اور نعت کا گوشہ تھا کہ جہاں شعراء حضرات نے بارگاہ خداوندی و بارگاہ رسالت مآب میں عقیدت کے جو پھول نچھاور کیے ہیں، اس کی مہک دل کے نہاں خانوں میں پوری طرح محسوس کی اور قلب رنجور سے یہ صدا بلند ہوئی کہ ہم بڑے گناہ گار بندے ہیں لیکن جو لوگ حمد اور نعت کہہ رہے ہیں، وہ یقیناً مقرب بندے ہیں اور بڑے اعزاز کے مستحق بھی۔

لاہور کے حوالے سے پہلا تاریخی مضمون بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ اس سے شمارہ کا آغاز کر کے متبدی کے لیے علم و معلومات کے جہاں کے دروازے کھولنے کی ابتدا کرتے ہوئے بڑی آسانی مہیا کی گئی ہے۔ کنہیا لال ہندی نے بڑے نپے تلے، دلچسپ انداز میں اندرون شہر کی جو نقشہ کشی کی ہے، اس سے پورا شہر ایک دم نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جناب انجد اسلام انجد کے مضمون سے بخوبی آگاہی ہوئی کہ یونیسکو کی جانب سے لاہور کو شہر ادب قرار دیے جانے کے پیچھے کون سے محرکات شامل ہیں اور کن لوگوں نے اس جد و جہد کا اعزاز پانے کے لیے خود کو پیش کیا۔ ان کی آزاد نظم بھی آئندہ صفحات میں موضوع کی مناسبت سے سوزوں تر تھی۔ "فون" میں جناب ابدال بیلا نے بڑے سیدھے سادھے انداز میں جس طرح لاہور کے چند ممتاز ادیبوں، شاعروں اور ان کی مجالس کے برپا ہونے کا مختصر سا تذکرہ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے عظیم لوگ تھے جو اتنے بڑے مقام و مرتبہ پر فائز ہونے کے باوصف اپنے تئیں معمولی خیال کرتے تھے اور اس کوشش میں غلطاں رہتے تھے کہ اپنا علم و ہنر اگلی نسلوں کو منتقل کر جائیں۔ افسوس اب ہم بونے لوگ نمایاں نظر آنے کی کوشش میں بڑے بے ڈھنگے انداز میں جگ ہنسائی کا سبب بن رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

اسلام عظمی کا "اچھے برج شہر لاہور دے" ایک قسم کا نوحہ تھا جس نے ماضی کی یادوں کو نشتر بن کر مسلسل چبھوئے رکھا اور جس کے دیے زخموں سے لہو نکل کر لاہور کی گلیوں میں بہنے لگا کہ اب یہ اچھے برج لاہور دے وہ نہیں رہے، جو ماضی میں تھے۔ ماضی بھی زیادہ پرانا نہیں بس کوئی بیس پچیس برس قبل تک۔ اب لاہور کے یہ نقوش ان تحریروں کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ میٹرو ٹرین اور اورنج ٹرین کی تعمیر نیز شاہراہوں کے پھیلاؤ نے پرانے لاہور کو قصہ پارینہ ہی بنا ڈالا ہے۔ اس مضمون میں البتہ لاہوریوں کی جو خصائل بیان کیے ہیں وہ کافی حد تک آج بھی موجود ہیں۔ یہ یقیناً زندہ دلان لاہور ہیں کا شہر ہے جو بڑے سمندر کی مانند ہر نئے آنے والے کو خود میں جذب کر لیتا ہے اور اس طرح جو ایک بار دریائے راوی پار کر لے، وہ پھر اجنبی نہیں رہتا۔

جناب جمیل یوسف کا مضمون "لاہور شہر ادب ہے" باکمال مضمون ہے۔ انھوں نے بڑی نفاست کے ساتھ چند ادیبوں اور واقعات کا ذکر کر کے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کے دریچوں میں سے جو کرنیں نمودار ہوئی ہیں وہ اگرچہ ہم تک پہنچی ہیں لیکن بڑی تلخی کے ساتھ کہ واقعی عظیم لوگ بند مٹھی میں ریت کی مانند پھسلتے ہوئے ہم سے دور جا رہے ہیں۔ محترمہ بشریٰ رحمان نے لاہور کو جس طرح بیان کیا ہے یہ انھی کا خصوصی ملکہ ہے اور انھوں نے اسے اپنی والدہ کا میکہ قرار دے کر اپنے ننھیال کا جو نقشہ کھینچا ہے، اب وہ لاہور عنقا ہے اور اس کی صرف تلخ و شیریں یادیں ہی پردۂ ذہن پر ستاروں کی مانند جگمگا رہی ہیں۔ جناب غافر شہزاد کے دونوں مضامین بڑے دلچسپ اور موضوع کی مناسبت سے شاندار ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق میں انھوں نے اجلاسوں کا جو نقشہ کھینچا ہے، ہو بہو یہی کیفیت ہمیں سیاسی جلسوں اور پروگراموں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ البتہ انھوں نے بڑی مہارت اور خوبی کے ساتھ ادیبوں کی باہمی کشمکش اور ان کی انا کا نقشہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ کھینچا ہے اور ہم جیسے مبتدیوں کو یہ سکھلا دیا ہے کہ جب بھی حلقہ میں کوئی چیز پیش کریں، تو اپنے چار پانچ حواری ساتھ ضرور لیتے جائیں۔

سید ریاض حسین زیدی نے جس طرح بیاض کی شان بیان کی ہے ہم سب کا بھی ہو بہو یہی خیال ہے۔ پھر یہ بھی کہ نئے لکھاریوں کی بھی بیاض خوب آبیاری کر رہا ہے۔ ذرائع آمدن نہ ہونے کے باوجود بیاض ادب کی اشاعت اور ترویج کی

جو خدمت سرانجام دے رہا ہے، اس پر بجا طور پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ جناب آفتاب احمد ملک نے آغا شورش کاشمیری اور چٹان کا جو مختصر سا تذکرہ فرمایا ہے اس سے ان عظیم لوگوں کی کچھ جھلک سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے آسمان ادب کے جگمگاتے چند ستاروں کا ذکر کر کے اپنے مختصر مضمون کو نہایت شاندار اور جاندار بنا دیا ہے۔ جناب رانا محمد شاہد نے اپنے مضمون میں ذاتی مشاہدات اور چند حوالہ جات بیان کرتے ہوئے لاہور سے متعلق ہمارے علم بھی خوب اضافہ فرمایا ہے۔ لاہور یقیناً ان ادباء شعرا کی نظر میں بلند تر مقام کا حامل تھا جس نے ان کے دلوں میں اس طرح جگہ بنالی کہ اب ان کے قارئین وہی حظ اور لطف انھیں پڑھ کر اٹھا رہے ہیں جو ان ادباء نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر تحریر فرمایا۔ ہم یہ سب اب صرف محسوس ہی کر سکتے ہیں۔

وقت کی کمی آڑے آ رہی ہے اور اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر مکتوب کی ارسالگی میں کچھ اور تاخیر ہوئی تو شاید یہ اشاعت سے رہ جائے۔ مجموعی طور پر بیاض کی یہ خصوصی اشاعت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور یہ پرچہ اب ریفرنس کے طور پر یقیناً ہر جگہ استعمال ہوگا۔ ادارتی بورڈ نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ ایک ادھ ماہ میں ہی ایسی خوبصورت پیش کش سے اپنے وسیع الطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے بھی کما حقہ انصاف برتا ہے اور قارئین کو ایسا مواد فراہم کیا ہے جس سے عام و خاص ہر فرد سیراب ہونے کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ البتہ مجھے اس امر کا ضرور افسوس رہے گا کہ میں اس قدر اہم اشاعت کا حصہ بننے سے محروم رہا۔

رانا محمد شاہد

جناب عمران منظور و اعجاز رضوی

السلام علیکم!

اپریل کے شمارے کی خاص بات ''گوشۂ لاہور'' تھا۔ بہت اچھا لگا کہ آپ نے سرِ ورق اور پس ورق کی پچھلی طرف شہرِ لاہور سے وابستہ معروف ادیبوں و شاعروں کی تصاویر شائع کیں۔ جو لاہور کی آن، بان اور شان تھے اور ہیں۔ ابدال بیلا اپنی تحریر کے ذریعے ہمیں برسوں پرانے فنون کے دفتر میں لے گئے۔ جہاں احمد ندیم قاسمی اور لاہور کے سنہرے ادیب اپنے اپنے رنگ و انداز میں بیٹھے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ کاربن کاپی کے حوالے سے ان کا واقعہ دلچسپ لگا۔ میں گزشتہ دنوں ایک اخباری کالم میں پڑھ رہا تھا کہ فوٹو کاپی مہنگی ہونے کی وجہ سے ان دنوں لکھنے والے اپنے لکھے کی ایک نقل تیار کر لیتے تھے۔ ایک بھجوا دیتے۔ دوسری اپنے ریکارڈ کے لیے رکھ لیتے۔ ظاہر ہے وہ لکھنے، پڑھنے والا دور تھا۔ آج تو لوگ ہاتھ سے لکھنا ہی بھولتے جا رہے ہیں۔ میں برسوں سے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور الحمدللہ آج بھی لکھنے کے لیے پن اور کاغذ کا استعمال کرتا ہوں۔ مجھے اکثر لکھنے والے کہتے ہیں کہ آپ بہت پیچھے ہیں۔ آج کون ہاتھ سے لکھتا ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر میں ہی لکھ کر بھیجا جاتا ہے۔ بس کیا کریں عادت سی ہوگئی ہے۔ امجد اسلام امجد، اسلام عظمی، جمیل یوسف، غافر شہزاد، سید ریاض حسین زیدی، آفتاب احمد ملک، ممتاز راشد لاہوری، شوکت محمود شوکت نے اپنے اپنے انداز میں لاہور سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ خاص طور پر بشریٰ رحمٰن کا مضمون ''میری ماں کا میکہ''.....لاہور'' دل سے لکھی گئی یہ تحریر دل میں گھر کر گئی۔ وہ گھر جہاں انسان کا بچپن گزرا ہو، ماں باپ کے ساتھ بیتا وقت گزرا ہو۔ اس گھر کے ساتھ انسان کے جذبات و احساسات ویسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے بشریٰ رحمٰن کی والدہ کے اُس وقت ہو رہے تھے۔ جب وہ ایک لمبے عرصے بعد لاہور کے شاہ عالمی محلّہ میں اپنا گھر تلاش کرنے آئی تھیں۔ بشریٰ آپا نے پرانے لاہور کی بہت سی خوبصورت یادیں آج کی نسل سے شیئر کیں۔ امجد اسلام امجد نے لاہور کو ملنے والے اعزاز کو ایک منفرد اور خوبصورت نظم میں پرو دیا۔ غافر شہزاد اور اعجاز رضوی کی نظمیں بھی پسند آئیں۔

''تیری مٹی مرے ماں، باپ کی چادر ٹھہری، اور اب میں اسی چادر کے لیے، رات دن سجدے کیے جاتا ہوں۔''

وسیم عباس کے یہ اشعار بھی پسند آئے:

تمام دکھ مرے خود میں سمیٹ لیتا ہے
یہ وصف آج بھی لاہور کے مزاج میں ہے
ہر ایک شخص کو رکھے پناہ میں اپنی !!
کمال خوبی مرے شہر کے رواج میں ہے

9 اپریل کو ایک واٹس ایپ گروپ میں یہ افسوسناک خبر شیئر کی گئی کہ ''معروف شاعر نجیب احمد آج لاہور میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) مئی کے دوسرے ہفتے میں ماؤں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اپنی والدہ کو یاد کیا ہے۔ امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔ والسلام

راحت سرحدی

بیارے عمران منظور بھائی!

اسلام علیکم!

نجیب احمد بھائی کے راہی ءملکِ عدم ہونے کی جاں کاہ خبر نے رلا رلا دیا ان سے بھی ہمارا محبت بھرا تعلق تقریباً" خالد بھائی کے ساتھ کا ہی ہے خالد بھائی کے بعد ان کا مشفقانہ ساتھ کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین

ادب اور بلخصوص بیاض کی لیے ان کی خدمات انہیں ہم سب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کی کمی کبھی پوری نہیں کی جا سکے گی۔

اللہ آپ کو اور بیاض کی ٹیم کو اس دکھ میں صبر اور حوصلے کی توفیق دے مرحوم کے لیے دلی دعائیں اور تعزیت آمین!

والسلام

حامد یزدانی

السلام علیکم!

عمران بھائی!

میں نے سوچا تھا کہ اس بار آپ سے جھگڑا کروں گا اور شکایتی پیغام بھیجوں گا کہ 'بیاض' کا گوشہ لاہور کے لیے مختص کیا اور مجھے اطلاع نہ دی کہ میں اپنے محبوب شہر کے حوالہ سے کوئی تحریر بھیج دیتا۔ مگر اچانک محترم نجیب احمد کی وفات کی خبر آ گئی۔ سو گلہ شکوہ سب بھول گیا اور رنج کا احساس طبیعت پر غالب آ گیا۔ اور پھر یادوں کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا کہ ایسا مضمون مکمل ہو گیا۔ نجیب احمد صاحب کی یادوں اور شاعری سے مزین یہ مضمون 'بیاض' اور اہل بیاض کی نذر ہے۔ اپنی اور نجیب صاحب کی وہ غزلیں بھیج رہا ہوں جو ایک ہی زمین میں ہیں۔ اور حسن اتفاق ہم دونوں نے ایک ہی عرصہ میں کہی تھیں۔ 'فنون' کے دفتر میں غزل سن کر نجیب احمد صاحب اور خالد احمد صاحب دونوں نے شاباش دی تھی۔ میرے لیے تو یادگار بھی ہے کہ اس سے نفیس مہربانوں کی یادیں منسلک ہیں۔ ایک گروپ فوٹو بھی ارسال خدمت ہے۔ بس جلدی میں یہی کچھ بن پڑا۔

آپ کا حکم ہے کہ تخلیقات پندرہ تاریخ تک پہنچا دیا کروں۔ تعمیل کر رہا ہوں۔

آپ کی صحت و سلامتی کی دعائیں اور جناب نجیب احمد کے لیے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا۔ والسلام

شب ریز

اکھراں پیڑاں لوئیاں
رفعت وحید

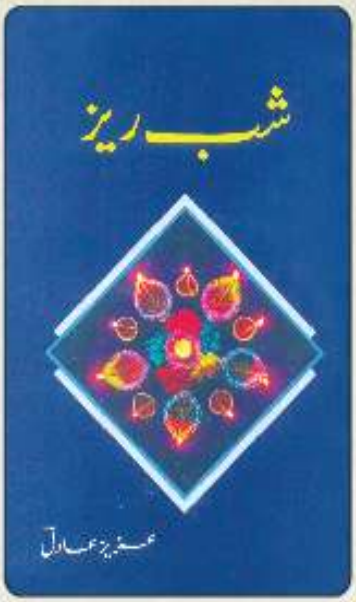

بے خوابیاں
سمیع خالد

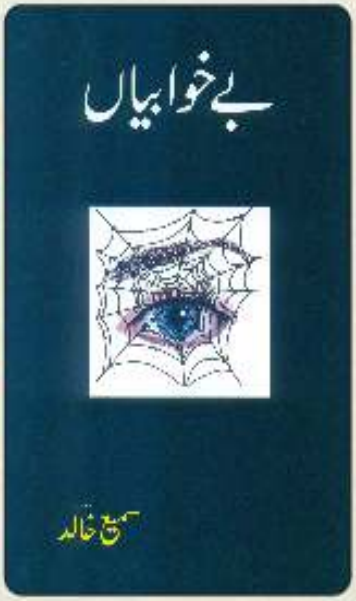

پھل چھوہی نئیں

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888